نشانِ راہ

مظہر الدین

حجازی سنز پبلشرز، میکلوڈ روڈ۔ لاہور

نشانِ راہ

مظہر الدین

الحاج کیپٹن منظور الحق

——— کے نام

جن کا عشق میری منزل کا رہنما ہے

گُل آورد سعدی سُوئے بوستاں

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 83849

بار: اوّل
تعداد: ۲۰۰۰
قیمت: ۵ روپے ۴ آنے
جلد اوّل

حجازی سنز پبلشرز، میکلوڈ روڈ۔ لاہور

TECHNICAL SUPPORT
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

پیش لفظ

"نشانِ راہ" میرے ان مضامین کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جو میں ابتدا ہی سے "کوہستان" کے لئے لکھ رہا ہوں۔ یہ مضامین چونکہ کسی خاص سکیم کے تحت نہیں لکھے گئے۔ من سے جو موج ابھری وہ کاغذ پر منتقل ہو گئی، اسی لئے ان کی ترتیب میں کوئی التزام نہیں برتا گیا ——— ترتیب و تنظیم کی افادیت سے انکار نہیں اور نہ ہی میں اس کا منکر ہوں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات سادگی میں جو بات ہوتی ہے وہ تکلف میں نہیں ہوتی۔ سادگی لوٹ لیتی ہے اور بے ساختہ پن مار ڈالتا ہے۔

قدرت کے جو مظاہر دریاؤں، پہاڑوں اور صحراؤں کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں ان میں کوئی تکلف اور تصنع نہیں، سادگی ہی ان کا حسن کہلاتی ہے اور بے ساختگی ہی نے انہیں متنوع اور دل پذیر بنایا ہے۔

دریا کی موجیں اگر اتنی نیزمی نہ ہوتیں تو شاید اتنی حسین و دلآویز نظر نہ آتیں۔ نشیب و فراز ہی نے پہاڑوں کو عظمتیں بخشی ہیں۔ پستیاں اور بلندیاں ہی ان کے جلال و جبروت کی آئینہ دار ہیں۔ صحراؤں کی معصومیت ہی ان کی دل کشی کی غماز کہلاتی ہے، ستارے لاکھ حسین و دلآویز سہی لیکن اگر یہ بکھرے ہوئے نہ ہوتے اور انہیں کسی خاص سلیقے اور قرینے سے سجایا جاتا تو منزلِ شب کے ان مسافروں کے خرام کا وہ حسن ظاہر نہ ہوتا جو فطرت کے پیشِ نظر تھا اور جسے قدرت انہیں بکھیر کر ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ خود انسان کی اپنی طبیعت کا یہ عالم ہے کہ اسے کسی حال پر قرار نہیں۔ احوال و تغیرات ہمیں نت نئی کیفیتوں سے آشنا کرتے ہیں۔ شادی و غم، رنج و راحت، کیف اور بے کیفی اور اس نوع کی دوسری کیفیتیں ہماری اثر پذیری کا نتیجہ ہیں اور انہی سے حیات کا دامن رنگین نظر آتا ہے۔

گہ گریم وگہ خندم چوں طفل بخواب اندر

طفل خواب میں ان کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے اور ایک حساس اور حالات و واقعات سے غیر معمولی اثر قبول کرنے والا انسان بیداری ہی میں ان لذتوں کو محسوس کرتا ہے اور میری یہ تحریریں اور جذبات و خیالات کی تصویریں اسی اثر پذیری کا نتیجہ ہیں۔ بہت ممکن تھا کہ میرے ان مضامین کے اشاعت پذیر ہونے میں دیر ہو جاتی اور یہ اشاعت پذیر ہو کر منصۂ شہود پہ نہ آتے لیکن بعض احباب کا خلوص انہیں کھینچ لایا ہے۔ ان کرم فرماؤں میں چودھری نذیر احمد سابق اٹارنی جنرل۔ راجہ احمد علی خاں سابق پارلیمانی سیکرٹری، اردو کے مشہور صوفی شاعر یوسف ظفر اور ملک رحیم بخش بچہ کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان احباب کا بھی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے مضامین کے تراشے بھیج کر مجھے اس قابل بنایا کہ میں انہیں موزوں صورت دے سکوں۔ ایک بھارتی ہندو ریڈر دھرم پال کی شکرگزاری کے لئے تو الفاظ نہیں ملتے جنہوں نے بھارت سے بہترین صورت میں مضامین کا انتخاب بھیج کر میری بہت بڑی مشکل حل کر دی۔

آخر میں اپنے قارئین کرام سے یہی کہنا چاہتا ہوں کہ

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم
حدیث عشق بے باکانہ گفتم
شنیدم آنچہ از پاکان اُمت
ترا با شوخیٔ رندانہ گفتم

نیازمند:۔ مظہر الدین

۱۶ نومبر ۱۹۶۲ء راولپنڈی

عبودیت کی تکمیل

ذرّوں سے لے کر ستاروں تک کی دنیا انسان کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ ہر ماہ و سال کی گردشیں، طلوع و غروب کے دل کش مناظر، صبح و شام کے حسین و دلآویز جلوے، موسمی تغیرات، سردی اور گرمی کی لذتیں، بہار و خزاں کی ندرت کاریاں، پستی و بلندی کی حیرت آفرینیاں، صحراؤں کا سکوت، دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی ایستادگی، جبروت مندی اور اسی نوع کی ہزاروں دلچسپیاں اور حسنہ بندیاں بلا فائدہ نہیں۔ کائنات کی کوئی چیز بھی بیکار پیدا نہیں کی گئی۔ ہر ایک کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے۔ جس چیز پر بھی نظر ڈالی جائے، وہ انسان کی خدمت میں مصروف نظر آتی ہے۔ انسان کے لیے زندہ و مُردہ مفید ہے۔ لیکن انسان ان میں سے کسی کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ اس کی تخلیق کا مقصد سب کی تخلیق سے جداگانہ اور مختلف ہے۔ انسان کو کائنات سے الگ کر دیا جائے تو ستاروں کے خرام میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ماہ و شہاب کی طلعتیں کم نہ ہوں گی، سورج کی روشنی بدستور ضیا بار رہے گی۔ ہواؤں کا خرام اسی طرح تموج آفریں رہے گا۔ قدرت کے یہ تمام کارنامے

جو مختلف شیلون و مظاہر کی صورت میں کائنات کے حسن و جمال میں اضافے کا موجب ثابت ہو رہے ہیں، اپنے فرائض ... میں کوئی کوتاہی نہیں برتیں گے ان کی حرکت کم نہ ہوگی ... فریضہ جس کے سپرد ہے، اس میں کوتاہی نہیں برتے گا، لیکن ان میں سے ایک چیز بھی اگر کم کر دی جائے تو کائنات کی وہ دلچسپی قائم نہیں رہ سکتی، جو ان مظاہر فطرت کی وجہ سے قائم و دائم ہے۔ بات ظاہر ہے یہ تمام ندرت آفرینیاں اور ندرت کاریاں صرف انسان کے ذوق جمال کو تسکین دینے کے لیے۔ اور اس کی حیات خیابانوں کو نئی بہاریں عطا کرنے کے لیے معرض وجود میں لائی گئی ہیں۔ لیکن انسان کو صرف عبودیت کی تکمیل کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ مظاہر پرستی کا مفہوم تو یہ ہوگا کہ آقا غلام کے سامنے جھک رہا ہے مخدوم خادم کے سامنے سجدہ ریزیاں کر رہا ہے۔ جن چیزوں کو اس کی غلامی کے لیے پیدا کیا گیا تھا، یہ انہی کو معبود جان کر ان کے سامنے جھک رہا ہے۔ حاشا و کلا انسانی تخلیق کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہو سکتا۔ تمام مظاہر قدرت کو انسان کی خدمت میں اسی لیے لگایا گیا ہے کہ وہ اپنی تخلیق کا مقصد سمجھے جو ذات ہواؤں کو کنٹرول کر رہی ہے جس نے ستاروں کو دلآویزیاں بخشی ہیں، اور بہاری کو بیستے اور مردہ زمین کو نئی زندگی عطا کرنے کی قوت سے نوازا ہے سبزے کو روئیدگی کی صلاحیت بخشی ہے۔ پھولوں کو تبسم عطا کیا ہے، اور

ہر چیز کی ضرورت کی تکمیل کا ذمہ لیا ہے۔ وسائل کے نہ ہونے کے باوجود وہ روزی عطا کرنے پر قادر ہے۔ اس کا خوانِ کرم اتنا غیر محدود، اتنا وسیع اور حکمتوں سے لبریز ہے کہ انسانی ذہن اپنی تمام تر طرفہ کاریوں کے باوجود اس کی لامحدود وسعتوں کو نہیں پا سکتا۔ اسی قادر وقیوم ذات کو اپنا مالک ومختار سمجھے، اور اسی کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار کرے۔ آفتاب وماہتاب کا غروب ان کی ناپائیداری کی دلیل ہے۔ پہاڑوں کی ایستادگی ان کی بے چارگی کی علامت ہے۔ غرض مظاہرِ فطرت میں سے کوئی چیز بھی قائم رہنے والی نہیں۔ ان کی بے چارگی اور تغیر ان کی فنا پذیری کی علامتیں ہیں۔ قائم و دائم رہنے والی صرف وہی حی وقیوم ذات ہے جب کچھ نہ تھا تو اپنی تمام تر قدرتوں کے ساتھ موجود تھی جب کچھ نہ ہوگا تو اس کی عظمتیں آشکارا ہوں گی۔ یہ کارخانہ قدرت صرف انسان کی عبودیت کے اعتراف واظہار کے لیے ہے جب تک اس کی زبان پر حمد کے ترانے رہیں گے اس کا دل تشکر کے جذبات سے لبریز ہوگا اور اس کی جبین اس کے آستانۂ جلال وجبروت پر سجدہ ریزیاں کرتی رہے گی، کائنات کی خدمت گاریوں میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ اس کا جلال باقی رہے گا اور جمال بھی جب زبانِ تشکر گنگ ہو جائیگی جبینوں سے سجدوں کا ذوق چھن جائے گا۔ عبودیت کے اعتراف واظہار کے سلسلے ختم ہو جائیں گے تو کائنات کے طلسم خانے کو باقی رکھنے کی بھی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔

دفعتاً سازِ دو عالم بے صدا ہو جائے گا
کہتے کہتے رک گئے جس دن ترا افسانہ ہم

حضوری کی لذتیں

کبریائی خدا تعالیٰ کی ذات کے لیے زیبا ہے بندے کا کام بندگی ہے۔ بندگی کا مقام چھوڑ کر بندہ کبریائی کا منصب اختیار کر لیتا ہے تو شداد، نمرود ہامان اور فرعون کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ بندگی کے مفہوم سے قطعی طور پر ناآشنا رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اپنی تخلیق کے مقصد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ بندے کا کمال یہ نہیں کہ وہ خدائی منصب پر ہاتھ مارنے کی کوشش کرے، عبودیتِ کاملہ ہی اسے بلندیاں اور سرفرازیاں عطا کر سکتی ہے۔ کافر رہبانیت کے لیے ترکِ لذات کرتا ہے۔ نتیجہ نکلتا ہے کہ غار زدہ کی زندگی اختیار کر لینے کے بعد بھی بندگی کے مفہوم سے بے خبر رہتا ہے اور مومن کی زندگی کا مقصد چونکہ بندگی کا حصول ہوتا ہے اس لیے تھوڑی سی عبادت بھی اسے بندگی کے مفہوم و معنی سے آشنا کر دیتی ہے۔ عبادت کرتے وقت مومن پر جو خشوع و خضوع طاری ہوتا ہے اس کی روح جن مستیوں اور سرشاریوں سے دوچار ہوتی ہے وہ کافر

کو نصیب نہیں ہو سکتیں۔ عبادت میں صحیح لطف اسی وقت آتا ہے جب بندے کو اپنے بندہ اور معبود کے قادر مطلق اور رحیم و کریم ہونے کا صحیح احساس ہو۔ اسی لیے عبودیت کبریٰ کے مفہوم و معنی سے آگاہ انسانِ کامل نے یہ تعلیم دی ہے کہ اپنے رب کی عبادت کرتے وقت یہ احساس بیدار ہونا چاہیئے کہ میں اس کی بارگاہ میں کھڑا اسے دیکھ رہا ہوں یہ سعادت نصیب نہ ہو تو کم از کم یہی خیال ہونا چاہیئے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

کثیف اشیا کی رویت کا تعلق حواسِ ظاہری سے ہوتا ہے کثیف کو دیکھا اور چھوا جا سکتا ہے لیکن لطیف کو محسوس کیا جاتا ہے اسے نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ چھوا جا سکتا ہے خوشبو بھی لطیف ہے اسے بھی ہماری ایک لطیف حس محسوس کرتی ہے۔ جو ذات لطیف ہو اس کی آمد کا احساس ہوتا ہے وہ ہماری گرفت میں نہیں آ سکتی۔ ذاتِ واجب الوجود بھی چونکہ کثیف نہیں بلکہ لطیف ہے اسی لیے اس کی آمد کا سراغ بھی احساسات کی دنیا سے لگایا جا سکتا ہے جب احساسات کی دنیا میں تلاطم بپا ہو، ذہن پر سنّاٹا شروع کر دیں تو آنے والے کا منتظر ہونے والے کی دنیا کی جشن سامانی کا پتہ دینے لگے تو سمجھنا چاہیئے کہ یار آ گیا۔ کیونکہ جب مدت کے دو بچھڑے ملتے ہیں تو آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ مومن کی نماز کو اسی لیے معراج المومنین کہا گیا ہے کہ یہ طالب و مطلوب کی ملاقات کا وقت ہوتا ہے حسن و عشق ہم آغوش ہوتے

ہیں دوری مٹ جاتی ہے اور قرب نصیب ہو جاتا ہے۔ کافر کی عبادت میں
نہ لذت ہے نہ سرور۔ جب ہجر و وصال کا احساس ہی نہ ہو تو کون روتا ہے؟ یا
جدائی کا احساس رلاتا ہے یا قرب کی سرشاریاں۔ کافر دونوں سے محروم ہے
اسے نہ جدائی کا احساس ہوتا ہے نہ قرب کی خواہش۔ وہ تمام عمر بننے کی فکر میں بیچارہ
بتوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے اور انہی حجابات میں دم توڑ دیتا ہے۔

کسی بادشاہ کے دربار میں دشمن کے اسلحہ سے لیس ہو کر کوئی حاضر
ہو تو شایانِ نوازش قرار نہیں پاتا۔ لطف و کرم کا مستحق وہی قرار پاتا ہے
جو مطیع و منقاد ہو جس کی ہر ادا سے اطاعت و فرماں برداری ظاہر ہوتی
ہو۔ جو لوگ عبادت کرتے وقت غلط آرزوئیں لے کر حاضر ہوتے ہیں،
سروں میں غیر کا سودا ہوتا ہے اور دل میں خواہشات کے لات و منات،
وہ عبادت سے لذت گیر نہیں ہو سکتے۔ عبادت ان کی ہے جو غلط آرزوؤں
سے نجات حاصل کر لیتے ہیں اور اپنے تمام امور خدا تعالیٰ کو سونپ دیتے
ہیں۔ وہی آرزو کرتے ہیں جو رضائے الٰہی کے مطابق ہو۔ وہی دعا مانگتے
ہیں جو حسنات کی ضامن ہو۔ پیٹ میں اگر حرام کا لقمہ موجود ہو تو کیا مالک حقیقی خوش
ہوگا یا اس کے غضب میں اضافہ ہو جائے گا؟ قرب کی لذتیں اور سرشاریاں
تو اپنوں کیلئے ہوتی ہیں۔ غیروں کو کون نوازتا ہے اور ان سے کھل کر کون بات کرتا
ہے؟ اس لئے تعلقات ہوں تو لباس بھی عملی پہننا پڑتا ہے۔ حضوری کے

بیلیے بھی ظاہری اور باطنی پاکیزگی کی ضرورت ہے۔

خدائی خدمت گار

سورج چاند ستارے شجر و حجر۔ پہاڑ اور دریا سب خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے مظاہر ہیں یہ سب خدا تعالیٰ کی اطاعت گزاری میں لگے ہوئے ہیں جس کے ذمے جو خدمت ہے، وہ انجام دے رہا ہے۔ ہر ایک کا ایک وظیفۂ حیات مقرر کر دیا گیا ہے۔ سورج کے ذمے ضوباری کی خدمت ہے، وہ ظلمت نہیں پھیلا سکتا۔ چاند کو خنکی عطا کرنے کی خدمت سونپی گئی ہے، وہ یہی وظیفۂ حیات سرانجام دے رہا ہے۔ ستاروں کو خرام بخشا گیا ہے ان کی گردش کم نہیں ہوتی دریاؤں کو جو روانی عطا کی گئی ہے وہ کبھی نہیں رکتے۔ قدرت کے یہ کارندے اپنے کام میں لگے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آفتاب و ماہتاب کی گردشیں رک گئی ہوں، ان کی ضوباریوں میں فرق آگیا ہو، حرارت و برودت عطا کرنے سے انہوں نے انکار کر دیا ہو یا ان کے طلوع و غروب کے نظام اوقات میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہو۔

قدرت کا یہ کارخانہ ایک بچے تلے نظام کے تحت چل رہا ہے جس میں کوئی تغیر ممکن نہیں خدائی خدمت گار پوری وفاداری سے مفوضہ

امور سرانجام دے رہے ہیں، اور ان سے کسی لغزش کا صدور ممکن نہیں۔

انسان اور تمام موجوداتِ عالم میں یہ بنیادی فرق ہے کہ انسان کے ذمے دوسری مخلوق کی طرح کوئی خاص خدمت نہیں۔ یہ سورج کی طرح ضوپاشی پر بھی مامور ہے، اور چاند کی طرح ٹھنڈک پہنچانے کا بھی ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ اسے بادِ بہاری کا خرام، پھولوں کا تبسم، ستاروں کی دلکشی، کوہساروں کی جبروت مندی، اور شبنم کی خنکی عطا کی گئی ہے۔ جلال وجمال کے اس مجموعۂ اضداد کو مختلف اور متنوع خدمات سونپی گئی ہیں جو فرائضِ حیات مختلف عناصرِ قدرت مل کر سرانجام دیتے ہیں۔ انہیں یہ تنہا سرانجام دے سکتا ہے اور اسے وہ تمام صلاحیتیں دے دی گئی ہیں جو اس کے لیے ضروری تھیں، کیونکہ یہ دنیا میں نائبِ حق اور زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ نیابت کا فریضہ سرانجام دینے کے لیے جلال وجمال دونوں کی ضرورت ہے۔ جلال نہ ہو تو یہ قہاری کا مظہر نہیں بن سکتا، جمال نہ ہو تو یہ غفاری کی شان نہیں دکھا سکتا۔

یوں بھی بادشاہوں کے دربار میں دو طرح کی مخلوق ہوتی ہے ایک کو نوکر کہا جاتا ہے اور ایک کو غلام۔ نوکروں کے ذمے خاص خاص کام ہوتے ہیں اور غلام کسی خاص خدمت پر مامور نہیں ہوتا۔ شاہ جو چاہتا ہے اس سے کام لیتا ہے۔ اس کی خدمت کے اوقات بھی مقرر

نہیں ہوتے۔ دربار میں ہمہ وقت اس کی حاضری ضروری ہوتی ہے۔ شاہ کا اشارہ ابرو پلتے ہی وہ کسی تامل کے بغیر خدمت میں مصروف ہو جاتا ہے۔ نوکروں خدمت سرانجام دیتا ہے جو اس کے ذمے ہو۔ نوکروں کو تنخواہ ملتی ہے لیکن غلام چونکہ زر خرید ہوتا ہے، اس لیے تنخواہ نہیں پاتا۔

مومن کی حیثیت رب تعالیٰ کے غلام کی ہے۔ سورج چاند ستارے اور اسی نوع کی دوسری تمام مخلوق نوکروں کی حیثیت رکھتی ہے، وہ خاص خاص فریضے سرانجام دیتے ہیں لیکن مومن کو حضوری میں رہ کر وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جس کا رب تعالیٰ کی طرف سے حکم ہو۔ کیونکہ مومن کے جان و مال کو جنت کے عوض خرید لیا گیا ہے۔ سودا ہو چکا ہے۔ قیمت ادا کر دی گئی ہے۔ اب اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ رب تعالیٰ کا حکم سن کر یہ کہے کہ یہ کام کروں گا اور یہ نہیں کروں گا۔ یہ میری مرضی کے مطابق ہے اور یہ میری مرضی کے مطابق نہیں۔ اب مرضی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غلام کو آقا کے سامنے چون و چرا کی مجال نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ غلام خریدا ہی اس لیے جاتا ہے کہ اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیا جائے۔ اس کے لیے ہمہ وقت کی حاضری ضروری ہوتی ہے۔ نوکروں کے لیے مخصوص کام ہوتے ہیں۔ اور ان کے لیے حاضری بھی ضروری نہیں ہوتی۔ عالم موجودات کی ہر چیز نوکر ہے اور مومن غلام۔

رحمت کی پردہ پوشی

قرآن حکیم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

"کیا بندے کے لیے اللہ کافی نہیں؟"

اس سوال کا جواب بندے کے ذوق و وجدان پر چھوڑ دیا گیا ہے بندہ جب خدا تعالیٰ کو اپنے لیے کافی سمجھ لیتا ہے، تو خدا اس کی ضرورتوں کا کفیل بن جاتا ہے۔ جب خدا کی ذات سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے، اور انسان عقل کی رہنمائی میں زندگی کی راہیں طے کرنے کا عزم لے کر اٹھتا ہے تو قدم قدم پر اسے ہزیمتوں اور ذلتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ بامراد ہو کر بھی ناکام رہتا ہے ایک باغی انسان کی وہ تمام کامیابیاں اور کامرانیاں جرم کی حیثیت رکھتی ہیں جو وہ اپنی حکومت کے آئین و قوانین سے انحراف کے بعد لوٹ کا مال فراہم کرنے سے حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی اپنی نگاہ میں خواہ یہ کامیابیاں کتنی بھی وقیع اور جاندار کیوں نہ ہوں، حکومت کی نگاہ میں وہ مجرم اور خطاکار ہوگا۔ کامیابی وہی کامیابی ہو سکتی ہے جو حکومت کے آئین و قوانین کے تحت رہ کر حاصل کی جائے۔ باغی اور خاطی انسان کی کامیابی حکومت سے خراج

تحسین وصول نہیں کر سکتی۔ حکومت کی رضا کے تابع رہ کر کسی محاذ جنگ پر زخمی ہونے والا سپاہی داد و دہش کا مستحق قرار پاتا ہے اس کی موت بھی واقع ہو جائے تو وہ کامیاب کہلاتا ہے۔ حکومت کی طرف سے اسے خوشنودی کی سند عطا ہوتی ہے اور رضا کا پروانہ ملتا ہے۔ بندہ بھی جب خدا کی راہ میں ہزیمتوں اور پریشانیوں کو برداشت کرتا ہے تو اسے خوشنودی کی سند عطا ہوتی ہے۔ شیطان کی راہ پر چلنے کے بعد جو کامیابی حاصل ہو وہ عارضی اور وقتی ہوتی ہے۔ اسے ثبات و دوام حاصل نہیں ہوتا۔ ایسی کامیابی میں نہ انسان کا ضمیر مطمئن رہ سکتا ہے اور نہ ہی اسے تسکین کی وہ دولت نصیب ہو سکتی ہے جو رضا کے بندوں کا حصہ ہوتی ہے تسکین رضا میں ہے تسلیم میں ہے اس راہ سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو یہ کبھی حاصل ہوئی ہے نہ ہوگی۔ باغی انسانوں کی کامیابیاں ان کی شکست کا پیش خیمہ ہوتی ہیں محاسبے کا ہاتھ جب بھی آستین سے نکلتا ہے، پندار کے تمام صنم کدے ویران کر کے رکھ دیتا ہے۔ ماخوذ مجرم کے تمام عذر عدالت کے روبرو پیش ہونے کے بعد باطل ہو جاتے ہیں۔ اس کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہوتا۔ یہ صرف خدائے رحیم و کریم ہی کی عدالت ہے کہ انسان کسی مرحلے پر بھی گناہ کا اعتراف کرے اور عجز کا سرمایہ لے کر اس کی بارگاہ میں حاضر ہو جائے تو اس کی بخشش و رحمت کا حق دار بنتا ہے۔ تمام عمر معصیت کی زندگی بسر

کرنے کے بعد اس کی رحمت کو پکارتا ہے تو مایوس نہیں لوٹتا۔ دنیا کی عدالتیں کسی انسان کو بار بار قانون شکنی کرنے کے بعد عادی مجرم قرار دے دیتی ہیں اور اس کے ساتھ کوئی رعایت برتنا گوارا نہیں کرتیں لیکن خدا تعالیٰ بار بار توبہ توڑنے والوں کو اپنی بارگاہ سے نہیں دھتکارتا، ہر بار ان کے لیے بخشش و رحمت کے دروازے کھلتے ہیں، عادی مجرم قرار دے کر توبہ کا دروازہ بند نہیں کر دیا جاتا۔

دنیا کے قانون اور خدا کے قانون کی فطرت جداگانہ ہے۔ ایک کو پکڑنے میں مزا آتا ہے، سزا دینے میں لذت محسوس ہوتی ہے اور ایک چھوڑ دینے کا عادی ہے معاف کر دینا اس کی عادت ہے۔ پکڑنے کے لیے حیلے بہانے تلاش کرتا ہے اور ایک چھوڑ دینے کے حیلوں بہانوں کی تلاش میں رہتا ہے تلاش دونوں کی مختلف ہے۔ مزاج دونوں کا جدا ہے عادت دونوں کی الگ ہے۔ ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت نہیں، کوئی علاقہ نہیں۔ ماخوذ ہونے اور گرفت میں آنے کا شوق ہو تو انسان کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت آنا چاہیئے۔ ان کی متابعت کرنی چاہیئے۔ رہائی اور نجات مطلوب ہو تو ربانی قوانین کی اطاعت قبول کرنی چاہیئے۔ چھوٹے ظرف والا اپنے ظرف کے مطابق معاملہ کرتا ہے۔ ظرف اگر غیر محدود ہو تو رحمت بھی غیر محدود ہو گی۔ خدا تعالیٰ کے عفو و کرم کا

سمندر چونکہ غیر محدود ہے اس کے کنارے ازل سے ابد تک پھیلے ہوئے ہیں اسی لیے اس کی رحمت کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ وہ بخشنے پہ آتا ہے تو ان مجرموں کو بخش دیتا ہے جن کی بخشش کی کوئی صورت نہیں ہوتی نوازنے پہ آتا ہے تو گداؤں کو شاہ بنا دیتا ہے۔ ملیے کریم کے دروازے سے صرف وہی لوگ محروم لوٹ سکتے ہیں جن کی نظر اس کے الطاف پر نہیں ہوتی اور جو گدائی کے سلیقے سے محروم ہوتے ہیں گدائی "دامن" کا سوز سخی کے رحم و کرم کو متحرک کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور بندے کی آواز میں جب سوز پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی صدا دردناک بن جاتی ہے، تو رحمت بڑھ کر اسے آغوش میں لے لیتی ہے اور اس کے لیے پردہ پوش بن جاتی ہے۔ پردہ پوشی خدا کی رحمت کا خاصہ ہے بشرطیکہ بندہ خود کو اس کا اہل ثابت کرے نیکی کی صلاحیتوں سے محروم نہ ہو

اِنسانی شرف

انسان کو خدا نے تکریم کا لباس پہنانے کے بعد جن نعمتوں سے نوازا ہے وہ اس کی عظمت و قدرت اور حکمت بالغہ کی بین نشانیاں ہیں ذہن انسانی کو جو رفعتیں نصیب ہوئی ہیں، زبان کو نطق و بیان کی جو قوتیں ملی ہیں، بصارت کو جو تیزی عطا ہوئی ہے، سماعت کو جو لطافتیں بخشی گئی ہیں، اور ذوق و وجدان

کوجو نزاکتِ احساس ودیعت ہوئی ہے۔ یہ سب آیاتِ الٰہیہ ہیں۔ ربانی عطیات ہیں، یہ نعمتیں خدا تعالیٰ کی امانت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انسان کو ان کا امین بنایا گیا ہے خزانچی مالک کی مرضی کے خلاف امانت میں تصرف کرے تو امین نہیں، خائن سمجھا جاتا ہے۔ امین خازن وہی ہوتا ہے جو مالک کی مِلک میں تصرف کرتے وقت اس کی مشیّت اور ارادے کو ملحوظ رکھے، جہاں جہاں اسے تصرف کا حق دیا گیا ہو وہیں تصرف کرے اور جن جن خطرات سے مال کو محفوظ رکھنے کی تلقین کی گئی ہو، ان سے مال کو بچانے میں امکانی کوشش صرف کرے۔

جو خازن اپنے مالک کے دشمنوں کے لیے خزانے کے دروازے کھول دے اور انہیں لوٹ کھسوٹ کی عام اجازت دیدے، ان سے مزاحم ہونے کی بجائے ان کا معاون ومددگار بن جائے، وہ آقا کے انعام واکرام کا مستحق نہیں ہوتا۔ دشمن کے ہراول دستے کا امام سمجھا جاتا ہے اور مالک کے غیظ وغضب کا مورد بنتا ہے۔ شایانِ کرم وہی خازن قرار پاتا ہے، جو جان دے کر بھی امانت کی حفاظت کرے۔ جو لوگ ذہانت کو اقدارِ عالیہ اور اخلاقِ فاضلہ کے خلاف صرف کرتے ہیں۔ جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز ثابت کرنے میں اپنی خداداد صلاحیتوں کو صرف کرتے ہیں، وہ امین نہیں؛ خائن ہوتے ہیں۔

ذہانت خیر کو پھیلانے اور شر کی روک تھام کے لیے عطا کی گئی ہے

نگاہ حق و باطل میں امتیاز کرنے کا آلہ ہے زبان کا وظیفہ یادِ دوست ہونا چاہیئے۔ یہی زبان اگر شیطانی قوتوں کی قصیدہ خوانی کرنے لگے نظر حق کا حسن و جمال دیکھنے کی بجائے باطل کی مٹ جانے والی چمک دمک پر مرکوز ہو جائے اور سماعت ذکرِ دوست سے لذت گیر ہونے کی بجائے لغو داستانوں اور کہانیوں میں کھو کر رہ جائے تو یہ نعمت کا صحیح استعمال نہ ہوگا۔ انسان کو ظاہری اور باطنی جو نعمتیں بھی دی گئی ہیں وہ مشیت کے تابع رہ کر استعمال کی جائیں تو انسان کو اشرفیت کے مقام پر فائز کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ورنہ انسان ارذل ترین مخلوق قرار پاتا ہے۔ درندے اور چوپائے کسی مبانی قانون کے پابند نہیں ہوتے۔ ان کی دنیا میں صرف جنگل کے قانون کی فرمانروائی ہوتی ہے۔ عقل و شعور اور فہم و ادراک کی دولت نہ انہیں تفویض ہوتی ہے، اور نہ ہی وہ اس سے کام لے سکتے ہیں۔ یہ صرف اشرف المخلوقات کا حصہ ہے۔ انسان بھی اس دولت سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اس سے کام نہ لے تو جانوروں سے ارذل ترین ہو جاتا ہے، کیونکہ انہیں یہ دولت نہیں ملی اور یہ اس کا مالک ہونے کے باوصف اسے غلط استعمال کرنے کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ ارتکاب گناہ کی سزا مجرم کو اس کے مقام اور مرتبہ کے مطابق ملتی ہے۔ حکومت کی طرف سے کسی انسان کو اعلیٰ اختیارات دیئے گئے ہوں، اسے سرکاری خزانے کا محافظ بنا دیا گیا ہو تو اس کے سرقہ کی سزا عام انسانوں کی سزا سے

مختلف ہوگی، ربانی قوانین کا مزاج بھی یہی ہے یہاں بھی مقام اور مرتبے کے اعتبار سے گرفت ہوتی ہے مقربین بارگاہ کو معمولی لغزش پر بھی تنبیہہ ہوتی ہے اور عام انسانوں کی ایسی فروگذاشتیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھی جاتیں۔ برہمنی فلسفہ ہی پروہتوں اور پنڈتوں کو تعزیرات سے مستثنےٰ قرار دے سکتا ہے۔ اسلام کا یہ مزاج نہیں۔ یہاں نسلی تفوق وجہِ امتیاز نہیں۔ انسانی شرف کا معیار تقویٰ ہے۔

دل کی رفتار

ایک غلام کے لیے شاہ کی بارگاہ کی حاضری سب سے بڑی نعمت ہوتی ہے۔ لیکن حضوری کی دہی نعمت، نعمت بن سکتی ہے جو شاہ کی ذات سے نسبت قائم ہونے کے بعد حاصل ہو۔ نسبت تو قائم نہ ہو، اور انسان صاحبِ حضوری ہو جائے تو یہ المیہ بڑا اندوہناک ہوتا ہے حضوری ہی ہلاکتوں کا سامان بن جاتی ہے حضوری وہی رحمت ہوتی ہے جس کے ذریعہ رضا کے پھول چنے جائیں، درگاہ سے وابستہ ہونے کے بعد اگر انسان کی توجہ رضا کے پھول چننے کی بجائے پست آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل پر مرکوز ہو جائے تو یہ وابستگی عذاب الٰہی سے کم نہیں

ہوتی، خواہشات کے غلبے کے باعث انسان آنکھیں ہونے کے باوجود اندھا ہو جاتا ہے اور شاہ کے جمال کی لذت سے محروم رہتا ہے۔ جمال کی لذت بھی انسان کے کیف وکم کا باعث بنتی ہے۔ جس کی نظریں جمال پہ ہوں حضرت علیؓ کو نماز میں جو لذت نصیب تھی یہ اسی کا کرشمہ تھا کہ حالتِ نماز میں ان کے بدن سے تیر کھینچ لیا جاتا تھا۔ اور انہیں خبر نہ ہوتی تھی یہ بے خبری کس نے عطا کی، مشاہدۂ جمال کی لذت نے حضوری کے کیف وسرور اور نسبت کے اس غلبے نے جو بندے کو اپنے مولا سے حاصل تھی حضوری وہی کیف و سرور بخش سکتی ہے جو نسبت اور تعلق کے فیضان سے خالی نہ ہو۔ ہر صاحب حضور، صاحبِ سرور نہیں ہوتا۔ بعض قریب رہ کر بھی دور رہتے ہیں بعض دور ہونے کے باوصف قریب ہوتے ہیں۔ اویس قرنیؓ دور ہونے کے باوجود قریب تھے اور ابوجہل قریب ہونے کے باوجود دور تھا۔

دراصل بے خبر لوگوں کو صاحبِ حضور کہنا ہی غلط ہے، دنیا والے قرب و بعد کا اندازہ فاصلے کی نسبت سے لگاتے ہیں، فاصلہ طویل ہو تو اسے بعد سے تعبیر کرتے ہیں، اور فاصلہ مٹ جائے تو اسے قرب کا نام دیتے ہیں۔ لیکن محبت کی بارگاہ میں قرب و بعد کا اندازہ جسم کے قرب و بعد سے نہیں لگایا جاتا یہاں دل کی رفتارِ کار کام دیتی ہے۔ روح کی پرواز کے ذریعہ حریم جمال تک رسائی حاصل کی جاتی ہے، جس کی یاد کے دل میں دیپ

جلنے لگیں، جو آنسوؤں میں فروزاں ہو، دل کی دھڑکن سے آشکار ہو وہ دور نہیں ہوتا۔ ہنسانے اور رلانے والا کبھی دور نہیں ہو سکتا۔ وہ تو احساسات میں مقیم ہوتا ہے۔ ساز کے تاروں کو مغنی کا ہاتھ نہ چھیڑے تو ان سے نغمے نہیں نکل سکتے۔ نغموں کا زیر و بم مغنی کی چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مغنی کا ارادہ کارفرما ہو تو ساز بجتے ہیں۔ تار ہلتے ہیں، اور ان سے نغمے پھوٹ کر روح کو بالیدگی بخشتے ہیں۔ سات پردوں میں چھپے ہوئے حسنِ مطلق کی تجلّیں روح پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ احساسات کی دنیا کو زیر و زبر کرتی ہیں تو انسان صاحبِ حضور بنتا ہے اور صاحبِ حضور بن جائے تو صاحبِ سرور بھی کہلاتا ہے کیونکہ سرور حضوری کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ قرآن میں بعض نمازیوں کی نماز پر اظہارِ تاسف کیا گیا ہے، حالانکہ نماز حضوری ہے لیکن جو حضوری کسی کیفیت اور لذت کے بغیر ہو وہ حجاب ہے، پردہ ہے، پردہ اٹھنے کا نام حضوری ہے۔ جمال کی لذت سے بہرہ ور ہونے والے کو صاحبِ سرور کہا جاتا ہے۔ غافل انسان نہ صاحبِ حضور ہو سکتا ہے، نہ صاحبِ سرور، وہ تو قریب رہ کر بھی دور ہوتا ہے، صاحبِ حضور ہونے کے باوجود نہ اس کے ہجر کے دن ختم ہوتے ہیں، اور نہ اس کی جدائی کی راتوں کو جلوہ تابِ سحر نصیب ہوتی ہے، اس کے مقدر میں ظلمتیں ہی ظلمتیں ہوتی ہیں، اور مجبوری کسی حال میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

منزلِ لیلیٰ

طلب اگر صادق ہو تو انسان کو واصلِ منزل بنا کر چھوڑتی ہے خامیٔ طلب کے باعث منزل کا قرب بھی طویل مسافت نظر آنے لگتا ہے۔ اور صدقِ طلب طویل مسافت کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔ قرب و بُعد دراصل اضافی امور ہیں۔ طلب کے صدق و کذب ہی سے ان کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ قصرِ شیریں عقلی نقطۂ نگاہ کے مطابق دور ہو سکتا ہے۔ عقل کو وہاں تک رسائی مشکل نظر آتی ہے لیکن فرہاد کے نزدیک وہ دور نہیں، وہ تیشے کے ذریعے یہ راہ عبور کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ وادیٔ نجد اور منزلِ لیلیٰ میں لاکھ بُعد سہی لیکن قیسِ عامری کا ولولۂ شوق اس بُعد کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اسے دو قدم ہی سمجھتا ہے۔ کسی مسافر کے پاس ولولۂ شوق کی متاع موجود ہو۔ اس کے سینے سے جذبات کے طوفان اٹھ رہے ہوں تو اسے محروم نہیں کہا جا سکتا۔ محرومی اس مسافر کا حصہ ہوتی ہے جو منزل کے شوق سے محروم ہو۔ اس کے دل میں کوئی اُمنگ پیدا نہ ہو سکے اور پیش آنے والے خطرات کا تصور اس کے پاؤں کی زنجیر بن جائے۔ اسے آگے بڑھنے اور مشکلات کا مقابلہ کرنے سے روکے شوق کی فراوانی دم توڑتے ہوئے

مسافروں کے دل پہ یاس کا غلبہ طاری نہیں ہونے دیتی وہ اسی محرومی کو کامیابی سمجھتا ہے۔ اور ذوق و شوق اور سوز و درد سے محروم انسان کو اگر کوئی حادثہ منزل سے ہم کنار بھی کر دے تو وہ عشق کی دنیا کی ان لذتوں سے شناسا نہیں ہو سکتا جو آبلہ پائ سفر کو ذوق و شوق میں نصیب ہوتی ہیں۔ اہل دل کے لیے محبت کی راہ کے کانٹے پھولوں سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ اور بوالہوس کے پیمانوں میں بھی کوئی ندرت نہیں ہوتی، وہ ان کی لطافتوں سے بھی صحیح طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتا، لطف اندوزی احساس کا نتیجہ ہوتی ہے۔ احساس اگر لطیف ہو تو وہ راہِ دوست میں بکھرے ہوئے کانٹوں کو بھی محبت کے پھول سمجھ کر دامن میں سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ احساس ہی اگر سرے سے مفقود ہو تو پھول بھی بُو باس نہیں دیتے محبت کی فراوانی کی بدولت یوسفؑ کی قمیص بیرِ نابینا کو کنعان میں بھی مست و سرشار کر سکتی ہے۔ اور برادرانِ یوسف اس کی حقیقت نہیں سمجھتے۔

محبت چمنستانِ قدس کے پھولوں سے نکلی ہوئی خوشبو کا نام ہے یہ بُو حواسِ ظاہری سے نہیں سونگھی جا سکتی۔ اسے محسوس کرنے کے لیے ایک اور حس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اسی حس کا نام بھی محبت ہے۔

مادی چیزوں کو ظاہری حواس کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے لیکن لطیف اشیاء کا لطیف احساسات ہی ادراک کر سکتے ہیں۔ یہاں تمام تر

محبت ہے ور محبت لطافت ، اسے عقل کی میزان پہ رکھ کر تولنے کی کوشش بے سُود ہوگی۔ یہ سود و زیاں کا سودا نہیں یہ صرف محسوس کی جا سکتی ہے اور اس کے اثرات سے ذوق و وجدان لذت گیر ہو سکتے ہیں۔

جن لوگوں نے مفاد حاصل کرنے کے لیے اور نقصانات سے بچنے کے لیے خدا تعالیٰ سے تعلق قائم کیا ہو۔ ان پر محبت کے معانی و مطالب کیسے آشکار ہو سکتے ہیں؟ محبت تو ایک آگ ہے جو اغراض کے تمام خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے عقل کا پانی اس آگ کو نہیں بجھا سکتا، بلکہ اس پانی سے اس کے شعلوں کی تیزی اور فزوں ہوتی ہے اور بڑھتی ہے۔

دنیا کی آگ پانی سے بجھائی جاسکتی ہے لیکن محبت کی آگ آبِ شمشیر سے بھی نہیں بجھتی۔ آبِ شمشیر سے اس کے شعلوں کے رقص میں اور اضافہ ہو جاتا ہے عقل محبت کے شعلوں کے رقص کے زاویوں کو سمجھنے سے اس لیے قاصر ہے کہ وہ کبھی جلی نہیں، اسے آگ نہیں لگی۔ وہ محبت سراپا آگ ہے۔ پروانے کی فطرت سمجھنے کے لیے سوز آشنا دل درکار ہوتا ہے؛ سوز سے خالی دل نہ اس کے تڑپنے اور لوٹنے کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان پر اس کے تپش و گداز کی حقیقت آشکارا ہوتی ہے۔

روح کی تابانیاں

انسان جس بارگاہ سے وابستہ ہوگا۔ اسی کی نسبت سے اُسے عظمتیں ملیں گی۔ پٹواری کے بستہ بردار کو وہ عظمتیں نہیں مل سکتیں جو تحصیل دار کی بارگاہ میں رہنے والے ملازم کو حاصل ہوتی ہیں۔ عالی بارگاہ کا ادنیٰ ملازم بھی عزت و عظمت کا مستحق سمجھا جاتا ہے اور ادنیٰ بارگاہ کی سرفرازی بھی عظمتیں عطا نہیں کرتی۔ بلکہ ایک شاہ کے دسترخوان کی ریزہ چینی کرنے والا شاہ کے دروازے سے اٹھ کر کسی معمولی درجے کے انسان کی بارگاہ میں عزت و عظمت حاصل کر بھی لے تو وہ ملامتوں کا مستحق قرار پاتا ہے۔ دنیا اسے تحقیر کی نگاہوں سے دیکھتی ہے اور اس کی کم عقلی کا ماتم کرتی ہے کہ وہ کہاں سے اٹھ کر کہاں آ گیا۔ جو عزت اسے نصیب ہوتی ہے وہی اس کی ذلتوں کا موجب بن جاتی ہے۔ اعلیٰ ذات کی بارگاہ کی محرومی شہدوں اور کمینوں کی بارگاہوں کی عطا و بخشش پر فوقیت رکھتی ہے شہدے اور کمینے کچھ عطا بھی کر دیں تو اس کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اور ہر بات کے وقت طعنہ دیتے ہیں کہ اتنا پانے کے بعد بھی تجھ میں تشکر کے جذبات پیدا نہیں ہوئے۔ کمینوں کی ساری عظمتیں محتاجوں کو ذلیل و رسوا کرنے

اور ان کی احتیاج کا اشتہار دینے سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اعلیٰ بارگاہ میں رہ کر انسان کو ان ذلتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ وہاں سے کچھ عطا ہو تو اس کا اشتہار نہیں دیا جاتا قصور ہو جائے تو معاف کر دیا جاتا ہے عطا و بخشش کے طعنوں سے غیرت و حمیت کے آبگینوں کو پاش پاش نہیں کیا جاتا کمینے کی درگاہ کی وابستگی خودی کی موت ہوتی ہے۔ یہاں رہ کر غیرت و حمیت سے محروم ہونا پڑتا ہے، ایک عظمت مل بھی جائے تو ان کئی عظمتوں سے محروم ہونا پڑتا ہے جو انسان کو قدرت کے عطیے کے طور پر مل ہوتی ہیں۔ کمینہ اپنی دی ہوئی عزت و عظمت کو چھیننے کے حیلے بہانوں کی فکر میں رہتا ہے۔ اور اعلیٰ ذات عظمتیں دے کر چھینتی نہیں، بلکہ ان کے تحفظ و بقا کی فکر میں رہتی ہے۔ کریم ذات کی عطا کردہ عظمتوں کو انسان اگر اپنی عدم صلاحیت کے باعث ضائع کر دے تو اسے قلق ہوتا ہے کہ اس نے نعمت کی قدر نہ کی، وہ اسے سرزنش کا مستحق سمجھنے کی بجائے رحم و کرم کا مستحق سمجھنے لگتی ہے اور اس کی مزید عنایات اس کے شامل حال ہو جاتی ہیں۔

گناہ گار کی توبہ اسی لیے قبول ہے کہ وہ سعادتوں سے محروم ہوتا ہے اس کی محرومی کے جذبات دل یزداں میں رحم و کرم پیدا کر دیتے ہیں رحمتیں اسے آغوش میں لینے کے لیے مضطرباً دوڑتی ہیں گناہ گار کی توبہ اسی لیے شایانِ کرم قرار پاتی ہے کہ اس میں عفا کی مظہر بننے کی صلاحیت موجود ہوتی

ہے۔ دل کی شکستگی خدا کو اسی لیے عزیز ہے کہ یہاں حسنِ فطرت کے جلووں کو سمیٹنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ آئینہ جلا پانے کے بعد حسن کی نظروں کا مرکز بن جاتا ہے، اور دل شکستہ ہونے کے بعد تجلیاتِ ربانی کا گہوارہ بنتا ہے۔ مقامِ تجلی لطافت ہے کثافت پر تجلی عکس ریز ہو بھی جائے تو اس کا حسن ظاہر نہیں ہوتا۔ کثیف جسم کے جلووں کو سمیٹنے اور انہیں آشکار کرنے کی صلاحیتوں سے فطرتاً محروم ہوتا ہے۔ ابوجہل پر انوارِ نبوت اس لیے اثر انداز نہ ہو سکے کہ اس کی روح کی کثافت انوارِ نبوت سے فیض یاب ہونے کی صلاحیت سے محروم تھی۔ ان لطیف جلووں کو تو وہی روحیں سمیٹ سکتی تھیں جو ازل سے پاک اور منزہ تھیں۔ فطرت میں پاکیزگی موجود ہو تو ہنگامی اور وقتی کثافتوں کے بادل بھی چھٹ جاتے ہیں۔ حسین جسم نہانے کے بعد اجلا ہو جاتا ہے اور حسین روح جس پر گناہوں کی کثافتیں چھائی ہوں، ندامت کے آنسوؤں سے غسل کر لیتی ہے، تو اس کی تابندگی اور تابانی ظاہر ہونے لگتی ہے۔ کھل کر بادل برستے ہیں تو فضا کا حسن زیادہ حسین اور دل آویز نظر آنے لگتا ہے۔ نیناں کی رِم جھم جو روح کی گہرائیوں سے احساسات کے اٹھنے والے بادلوں کے خرام کا نتیجہ ہوتی ہے، روح کو شگفتگی اور شادابی عطا کرتی ہے۔ رم جھم کوئی بھی خالی نہیں جاتی۔ خواہ وہ برسنے والے بادلوں کے خرام کا نتیجہ ہو۔ یا ندامت سے جھکی ہوئی پلکوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں کا ثمر

دونوں نتیجہ خیز ہیں اور دونوں تحفے آفریں! ایک کی معذوبیت ویرانوں کو گل و گلزار بناتی ہے۔ اور ایک کی جاذبیت رحمتوں کو دراز ہونے اور ان کا سلسلہ وسیع تر کردینے کا موجب بنتی ہے ایک کا فیضان گل و گلزار ہوتے ہیں اور ایک کا عطیہ روح کی تابانیاں

تجلّی کا پیام

خدا تعالیٰ کی رضا کا معاملہ تو خیر بہت دور کی بات ہے۔ قربانی دیئے بغیر بندے کی رضا بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ایک دوست کی رضا حاصل کرنے کے لیے بسا اوقات سخت سے سخت ترین مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اور کبھی آبرو کو لاحق ہونے والے خطرات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

محبت چیز ہی ایسی ہے کہ قربانی چاہتی ہے یہ پودا ہی ایسا ہے، جس کی آبیاری کے لیے آرزوؤں اور تمناؤں کا خون درکار ہوتا ہے۔ اس پر بہار ہی نہیں آتی جب تک اس کی خون سے آبیاری نہ کی جائے۔

پھر جس قسم کی محبت ہو گی اسی نوعیت کی قربانی کا مطالبہ کرے گی۔ محبت کے کچھ مقامات ایسے ہیں جنہیں ہنستے کھیلتے طے کیا جا سکتا ہے۔

بعض جگہ مال کی قربانی کی ضرورت پیش آتی ہے اور بعض جگہ جان قربان کرنے کے بعد بھی ذوق کی سیرابی نہیں ہوتی۔ جی یہی چاہتا ہے کہ ہزار جان ہوتی قربان کر دیتا۔

یک جاں چہ کند سعدی مسکیں کہ دو صد جاں
سازیم فدائے سگِ دربانِ محمدؐ

انسان میں مسکینی بھی محبت ہی پیدا کر سکتی ہے عقل سر فرازوں کی گردن کو اور اونچا کر سکتی ہے لیکن جھکا نہیں سکتی یہ محبت ہی کا شیوہ ہے کہ وہ ساری سرفرازیاں محبوب کی بارگاہ میں قربان کر دینے کو اپنے لیے موجبِ فخر سمجھتی ہے

عشق ازیں بسیار کردست و کند

عقل کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ لوٹنا چاہتی ہے اور لٹنا صرف محبت کا شیوہ ہے اور اسے لُٹ کر نہیں لٹ کر مزا آتا ہے۔ پروانے نے ادائے جاں نثاری کسی مکتب میں رہ کر نہیں سیکھی، سوز اس کی فطرت میں موجود تھا، شمع کو دیکھا تو جل گیا۔ صدیق رضؓ نے شمعِ رسالت کو دیکھا تو ادائے جاں نثاری سے صدیقیتؓ کے رتبے کو پہنچ گئے محبتِ چونکہ خود صدیق ہے اس لیے صدیق بنا دیتی ہے عقل خود غرض ہے اسلئے زندیق بنا کر چھوڑتی ہے۔ صدیق بننے کے لیے محبت کے کوچے میں آنا پڑتا ہے، اپنے اندر ایسی صفات پیدا کرنی پڑتی ہیں جو محبوب کو مرغوب ہوں، ورنہ زندیق بنتا گیا!

مشکل ہے، ادھر نفس کی بندگی اختیار کی اور ادھر زندیق کا مقام مل گیا۔

ہوس کی باگ ڈور عقل کے ہاتھ میں ہے
وہ ہمیشہ مفاد کی طرف رہنمائی کرتی ہے

محبت مفاد پرست نہیں وہ مفاد قربان کرنا جانتی ہے عقل نے ہمیشہ اپنے مفاد کو مدّنظر رکھا ہے۔ اور محبت کے پیشِ نظر محبوب کی رضا رہی ہے۔ محبت رضائے دوست کے لیئے قربانی دے کر جھومتی ہے۔ خوش ہوتی ہے۔ ایثار کے بعد اسے یہ احساس ستاتا ہے کہ مال وجان کی صورت میں حسن کی بارگاہ میں جو پیش کش کی گئی ہے وہ حسن کے قابل نہ تھی کہیں ایسا نہ ہو کہ محبوب اسے حقیر جان کر ٹھکرا دے لیکن عقل کی یہ عادت نہیں وہ ہر میدان میں ترانہ دے کر بیٹھتی ہے، چاہتی ہے کہ اسی کا پلڑا بھاری رہے اور محبت جان دے کر بھی سودا کرتی ہے تو سمجھتی ہے کہ سستا ہے۔ ازل سے اس کا نعرہ یہ ہے۔

اگر قیمت بہ جاں بودے چہ بودے

عقل اپنے لیے سہولتیں تلاش کرتی ہے اس لیئے کہ وہ سہل انگار ہے عشق جفا پیشہ ہے وہ سہولتیں تلاش نہیں کرتا۔ مشکلات کو آسان بنا دیتا

ہے کوہ کنی اور تیشہ زنی اس کی فطرت ہے، اسے نہ مزدور بننے میں عار محسوس ہوتی ہے نہ مزدور کہلانے میں، کبھی تیشہ بدست نظر آتا ہے اور کبھی علم بردوش۔

دونوں صورتوں میں اس کا مقصود اپنی برتری کا اعلان نہیں ہوتا تیشہ کے ذریعے بھی وہ وصالِ محبوب کی آرزو کرتا ہے اور علم بھی اس کے نزدیک محبوب کی برتری کا نشان ہے اپنا نام و نشان مٹا کر محبوب کی عظمتوں کا اجاگر کرنا عشق و محبت کی سب سے بڑی آرزو ہوتی ہے اور عقل ہر جگہ اپنی ہی برتری چاہتی ہے رزم ہو یا بزم، دونوں جگہ وہ اپنا ہی بھلا چاہتی ہے

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ زاہد ہے نہ مُلّا نہ حکیم

محبت اپنی فطرت کی پاکیزگی کی وجہ سے واصلِ منزل ہے اور عقل کے مقدر میں ریب و شک کے اندھیرے ہیں یہ کامیاب ہو کر بھی ناکام رہتی ہے۔ اور وہ ناکامیوں میں بھی وہ مزے لوٹتی ہے جو کامیابیوں سے ہمکنار ہونے والوں کو نصیب نہیں ہو سکتے۔ نصیب اپنا اپنا ہے۔ ایک کے مقدر میں ظلمتیں ہیں اور ایک سراپا نور اور تجلی کا پیام۔

نائبِ حق

دنیا کا یہ نظام جس ذات کی مشیت کے تحت چل رہا ہے وہ کامل و اکمل ذات ہے۔ وہی اپنی مصلحتوں کو بہتر سمجھتی ہے۔ پہاڑوں کو ایستادگی اسی نے بخشی ہے۔ دریا اسی کے حکم سے جاری ہیں۔ ستاروں کی مشعلیں اسی نے روشن کی ہیں۔ پھولوں کا رنگ اور بو اسی کا عطیہ ہے اور آفتاب و ماہتاب کی گردشیں اسی کا فیضان جمیل ہیں۔

کوئی شخص قدرت کے نظام کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا چاہے تو یہ ناممکن ہے۔ اپنے وقت پر آفتاب کا طلوع و غروب کسی کو پسند آئے یا نہ آئے اس میں کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی۔ آفتاب اپنے وقت پر طلوع ہوگا اور وقت پر ڈوبے گا۔ دریاؤں کی روانی کسی کی خواہش کے مطابق نہیں رک سکتی۔ جو خدمت جس کے ذمہ ہے وہ مالکِ حقیقی کا فرماں بردار ہونے کی حیثیت سے سرانجام دے رہا ہے۔ قدرت کے نظام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے تو اس کے حسن میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ کبیدہ خاطری سے دیکھا جائے تو پھر بھی یہ جوں کا توں چلتا رہے گا۔

معمولی درجہ کے بادشاہ بھی کسی گھسیارے کے مزاج کی رعایت کرکے اپنے آئین وضوابط میں ترمیم کرنا گوارا نہیں کرتے تو اس ذات سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ معمولی درجے کے انسانوں کے مزاج کی رعایت کرکے اپنے فیصلے بدل دے گی؟

کسی ذی اختیار کو جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے ماتحت اس کے فیصلوں کا احترام کرتے ہیں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ محتاج اور نادار لوگ جن کی زندگی کا تمام تر انحصار کسی سخی کے رحم و کرم پر ہے ان کے متعلق جب سخی کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے فیصلوں کو قابلِ ترمیم سمجھتے ہیں تو اس کا غیظ و غضب بھڑک اٹھتا ہے۔ سخی کے کرم کو یہ متحرک کرنے کا طریقہ نہیں، یہ اس کی عنایتوں سے محرومی کے انداز ہیں۔

غلام، آقا کے فیصلوں میں ترمیم بھی کرا سکتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب بندہ خواجہ کے مزاج میں ڈھل جائے۔ اس کی نگاہوں میں محبوبیت کا درجہ حاصل کرلے۔ ہر غلام ایاز نہیں بن سکتا اور نہ ہی محمود ہر زلف کے پیچ و خم میں اسیر ہو سکتا ہے۔ جتنی بڑی ذات کے اعتماد کو جیتنا مقصود ہو اتنی ہی بڑی ادائیں پیدا کرنی پڑتی ہیں۔

آگ اسی وقت گلزار بنے گی جب خلیلؑ کا منصب حاصل
ہوگا اور چھری گلے پر اسی وقت رکے گی جب اسمٰعیلؑ کی

اطاعت نصیب ہو گی تسلیم و رضا کا پیکر بن جانے کے بعد بندے کو یہ منصب بھی نصیب ہو سکتا ہے کہ حسن مطلق برافگندہ نقاب ہو کر اس سے یہ پوچھنے لگے کہ بتا! تیری رضا کیا ہے؟

لیکن یہ منصب ہر ایک کو نصیب نہیں ہو سکتا محبت کا دل باتوں سے نہیں جیتا جا سکتا۔ بہت سے صحراؤں اور بیابانوں کی خاک چھاننی پڑتی ہے تب کہیں جا کر حسن کی بارگاہ میں باریابی نصیب ہوتی ہے۔

مقرب اور مقبولِ بارگاہ بنا لینے کے بعد ہر ذات اپنی قدرت اور اپنے اختیار کی نسبت سے وارثی ہے محتاج ذات مقرب بنالے گی تو احتیاج ختم نہ ہو گی۔ لامحتاج ذات نے ہاتھ پکڑ لیا تو کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ ادھر ارادہ ہوا اور ادھر پورا ہو کر رہے گا۔

دنیا کی بھی عجیب ریت ہے۔ یہاں کے لینے والے رشتہ تو جوڑتے ہیں ان لوگوں سے جو خود محتاج ہیں۔ ان آستانوں کو اپنا حاجت روا سمجھ لیتے ہیں جن کی احتیاج کبھی ختم نہیں ہوتی اور چاہتے یہ ہیں کہ خود لامحتاج ہو جائیں۔ احتیاج کو لامحتاج ذات ہی ختم کر سکتی ہے۔ محتاج سے تعلق قائم ہو گا تو احتیاج ختم نہ ہو گی اور لامحتاج ذات سے تعلق قائم ہو گیا تو کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

مشیّت ربانی میں ڈھل جانے کے بعد بندہ، بندہ ہی رہتا ہے لیکن وہ صفاتِ ربّانیہ کا مظہر بن جاتا ہے۔ اس کا ارادہ خدا کا ارادہ اور اس کی زبان خدا کی زبان ہو جاتی ہے۔ احتیاج ختم ہو جاتی ہے۔ اور اسے نائبِ حق کا منصب سونپ دیا جاتا ہے۔

موج و اضطراب

دل کی لگن کے بغیر کوئی کام انجام نہیں پاتا۔ دل میں اگر لگن موجود ہو، جذب و شوق کی دنیا آباد ہو، جذبات کی تند و تیز موجیں پیہم اٹھ کر احساسات میں تلاطم پیدا کر رہی ہوں اور عزائم کو نئی تاب و تواں مل رہی ہو تو انسان پر ناکشودہ راہیں کھلنے لگتی ہیں۔ جن مشکلات کا حل ناممکن نظر آتا ہے۔ وہ بھی آسان ہونے لگتی ہیں۔ اور اگر سینے میں ذوقِ آرزو مردہ ہو گیا ہو، حیات کو نئی تابندگی عطا کرنے والے سوتے خشک ہو گئے ہوں تو حیات کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ معمولی مشکلات بھی انسان کو نیم مردہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ زندگی کی تڑپ اور ولولہ، زندہ اور بیدار دل کے جذبات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ دل کو بیداری سوزِ آرزو سے ملتی ہے۔ مردہ قالب میں روح نہیں ہوتی، اور اس سے کسی معجزانہ کارنامے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اسلام نے

اپنے ظہور کے ساتھ ہی مردہ دلوں کو زندگی عطا کی تھی۔ انہیں زندگی اور موت
کے مفہوم سے آشنا کیا تھا۔ اسلام چلتی پھرتی لاشوں کو زندہ نہیں کہتا۔ اس کے
نزدیک زندگی دل کی حیات کا نام ہے۔ دل کو خدا کی یاد سے زندگی ملتی
ہے۔ عبد اور معبود کا رشتہ جب جڑ جاتا ہے تو دل میں حیات آفریں جذبات پیدا
ہونے لگتے ہیں۔ جذبات کا یہ سمندر سینے میں موجزن نظر آنے لگتا ہے۔
جس کی ہر موج حسین ہوتی ہے، متموج اور ولولہ انگیز ہوتی ہے جو سنگلاخ چٹانوں
سے ٹکرا کر انہیں پاش پاش کر دیتی ہے، ساحل کو آغوش میں لیتی ہے تو بہا کر
لے جاتی ہے۔ موج کی فطرت میں اضطراب ہوتا ہے۔ وہ ازل سے مضطرب
ہے اور ابد تک مضطرب رہے گی۔ اضطراب ہی اس کا سرمایۂ حیات
بنتا ہے اور اضطراب ہی اس کی زندگی کا ضامن کہلاتا ہے۔ موج سے
اضطراب کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں کی تفریق ممکن نہیں اور اگر ان
میں افتراق پیدا ہو جائے تو وہ دونوں کی فنا کا باعث ہوگا۔ موج اضطراب
سے ہے اور اضطراب موج سے۔ جو دریا موج و اضطراب کی دولت سے
محروم ہو، وہ اپنی تخلیق کے مفہوم سے ناآشنا رہے گا۔ مومن کا دل بھی مضطرب
موجوں کا امین ہوتا ہے، کائنات کا سارا درد سمٹ کر اس کے سینے میں
آجاتا ہے، سینۂ دریا پر ابھرنے اور مچلنے والی موج دریا کے اندرونی ہنگاموں
کی غماز ہوتی ہے۔ کائنات کے سینے سے جو چیخ نکلتی ہے، وہ مومن کے

وہ ایسا اضطراب عطا کر دیتی ہے، جو دل کائنات کی چیخیں سن کر بے تاب نہیں ہوتا، انسانیت کے درد سے بے تاب ہو کر اس کے مداوے کے لیے مضطرب اور پریشان نہیں ہو جاتا، وہ ایک شقی القلب انسان کا دل تو ہو سکتا ہے۔ لیکن اسے کسی صورت میں بھی مومن کا دل کہنا درست نہ ہوگا۔ دل کی تو فطرت ہی یہ ہے کہ جسم کے کسی حصے کو گزند پہنچے تو وہ سینے کے اندر تڑپنے لگتا ہے۔ یہ کارخانۂ قدرت، اور یہ آب و گل کی دنیا جسے ہم کائنات کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس میں مومن کی حیثیت دل کی ہے۔ کائنات کے سینے میں کانٹا بھی چبھ جائے تو مومن اس کی کسک اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ لیکن یہ صرف اسی وقت ممکن ہے، جب مومن کا دل بیدار ہوتا ہے۔۔ سرمدی سرچشمۂ حیات سے بدستور فیضان پہنچ رہا ہو۔ بندے کے انحراف سے مولا خوش نہیں ہوتا۔ کسی نقاش کو اپنے نقش کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی خواہ وہ کتنا ہی غیر جاذب اور غیر دلچسپ کیوں نہ ہو۔ عبد کا معبود سے رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ تو اس میں ربانی صفات جھلکنے لگتی ہیں، وہ اپنے مولا کی صفات کا مظہر اور آئینہ بن جاتا ہے۔ اس کا دل بھی بلا امتیاز مذہب ملت اور رنگ و نسل ان کی پریشانیوں پر کڑھنے لگتا ہے۔ وہ ان کے درد کو اپنا درد محسوس کرکے اس کے مداوے کی کوشش میں مصروف نظر آنے لگتا ہے۔ آفتاب کا فیض چمنستانوں اور بیابانوں تک ہی نہیں ہوتا۔

غلاظتوں پر بھی پر تو افگن ہوتا ہے اور ظلمتیں اس سے اکتسابِ نور کرتی ہیں۔ مومن کا دل بھی سرچشمۂ فیضانِ الٰہی ہے وہ ہر طرف تجلیاں بکھیرتا ہے، ظلمتوں کو نور کے قالب میں ڈھالتا ہے اور دکھیا دلوں کے لیے مرہمِ شفا ثابت ہوتا ہے۔ ان صفات کا حامل نہ ہو تو اسے سرچشمۂ فیضانِ الٰہی نہیں کہا جا سکتا، وہ بخیل ہوگا اور بخیل، فطرت کا نمائندہ نہیں ہو سکتا۔

لگن کے کرشمے

ہر چیز میں ایک لذت ہے، خواہ وہ اچھی ہو یا بُری! شرابی کو شراب نوشی میں مزا آتا ہے، قمار باز کو قمار بازی میں راحت محسوس ہوتی ہے۔ راہزن راہزنی میں لذت محسوس کرتا ہے، اور ایک رحیم و کریم انسان کسی کو مصیبت میں مبتلا دیکھ کر اپنی راحتیں قربان کر دیتا ہے، تو وہ ایثار میں لذت محسوس کرتا ہے۔

لذت دراصل اپنی ہی لگن کی ہوتی ہے کسی ذات سے لگن ہو تو اس کی جفائیں بھی مزا دیتی ہیں، لگن نہ ہو تو وفائیں بھی مزا نہیں دیتیں فصاحت و بلاغت سے لبریز تقریر بھی دل پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ ماں کو بچے سے چونکہ پیار ہوتا ہے اس لیے اس کی توتلی باتیں اور شکستہ جملے بھی ماں کی روح میں

ایک مستی اور کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ توتلی زبان سے اماں کہتا ہے تو ماں کا دل مستیوں اور سرشاریوں سے بھر جاتا ہے کسی دوسرے کی فصیح و بلیغ تقریر ماں کے دل میں یہ مستی و سرشاری پیدا نہیں کر سکتی۔ مستی اور سرشاری صرف لگن کا نتیجہ ہوتی ہے۔

لگن ہو تو بچے کے رونے میں بھی مزا آتا ہے، اور پکار سننے میں بھی راحت محسوس ہوتی ہے لگن جہاں بھی ہوگی اپنا اثر دکھائے گی۔ شراب مقصودِ حیات بن چکی ہو تو اس کا ذکر بھی مزا دے گا۔

بالعموم دیکھا گیا ہے کہ جب شرابی مل کر بیٹھتے ہیں تو شراب کی قسموں اور ان کی لذات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ تذکرہ بھی انہیں سرور بخشتا ہے۔ یہ سرور بھی لگن کا ہوتا ہے۔ افیون کھانے والوں اور بھنگ پینے والوں کو شراب کے تذکرے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ جو جس کا طالب ہوگا، اسی کو یاد کرے گا، اسی کو یاد کرے گا۔ اسی کے ذکر میں لذت محسوس کرے گا، احساسات کی دنیا پر جو بھی چھایا ہوگا، اسی کی یاد آئے گی، اسی کا ذکر زبان پہ ہوگا اور اسی کی یاد لذتیں عطا کرے گی۔

بیمار جسم کو غذا کی لذت نصیب نہیں ہو سکتی۔ اور بیمار روح کو خدا کا نام لینے میں مزا نہیں آتا۔ تعلق ہی نہ ہو تو مزا کیسا؟ لگن ہی نہ ہو تو مستی کیسی؟ سوتیلی ماں کو بچہ سو بار اماں کہہ کر پکارے تو اس کی پکار بے اثر

ہوگی۔ نہ پکارنے والے کے دل میں کوئی مستانہ جذبہ پیدا ہوگا ورنہ ہی سننے والی ذات کی سماعت لذت گیر ہوگی دونوں لذت سے محروم رہیں گے۔

پکار وہی متاثر کر سکتی ہے جو دل سے نکلی ہو۔ دل سے نکلی ہوئی صدا کبھی رائیگاں نہیں جاتی وہ اثر انداز ہو کر رہتی ہے۔ جذبات میں ہیجان اور طوفان پیدا کر دیتی ہے۔ احساسات کا ایک ایک تار ہلا دیتی ہے۔ سوز و درد سے محروم اجنبی آواز نے کب کسی دل میں محبت کے جذبات پیدا کئے ہیں اور اسے سوز و درد سے آشنا کیا ہے؟ آشنائی ہی آواز میں سوز پیدا کرتی ہے، اور سوز سے شناسا کرنے کا موجب ثابت ہوتی ہے، بیگانوں کی آواز میں اثر نہیں ہوتا۔ بندے کا بھی جب مولا سے رشتہ جڑ جاتا ہے تو آواز میں خود بخود سوز و درد پیدا ہونے لگتا ہے۔ یاد بھی مزا دینے لگتی ہے۔ اور پکار بھی، اور یہی پکار اس کی بارگاہ میں قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے

بیگانہ وار پکارنے سے نہ خود کو مزا آتا ہے، اور نہ یہ پکار حریم ناز کے پردوں میں کوئی جنبش پیدا کر سکتی ہے۔ دل سے نکلی ہوئی پکار کے ذریعے حریم جمال کے پردے بھی اٹھنے لگتے ہیں اور دل بھی لذات و کیفیات کا مخزن بن جاتا ہے۔ یہ سب لگن کے کرشمے ہیں اور باہمی نسبت و تعلق کی معجز نمائیاں

ایک مستی اور کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ توتلی زبان سے اماں کہتا ہے تو ماں کا دل مستیوں اور سرشاریوں سے بھر جاتا ہے کسی دوسرے کی فصیح و بلیغ تقریر ماں کے دل میں یہ مستی اور سرشاری پیدا نہیں کر سکتی۔ مستی اور سرشاری صرف لگن کا نتیجہ ہوتی ہے۔

لگن ہو تو پکارنے میں بھی مزا آتا ہے اور پکار سننے میں بھی۔ راحت محسوس ہوتی ہے لگن جہاں بھی ہوگی اپنا اثر دکھائے گی۔ شراب مقصودِ حیات بن چکی ہو تو اس کا ذکر بھی مزا دے گا۔

بالعموم دیکھا گیا ہے کہ جب شرابی مل کر بیٹھتے ہیں تو شراب کی قسموں ان کی لذات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ تذکرہ بھی انہیں سرور بخشتا ہے اور یہ در اصل لگن کا ہوتا ہے۔ افیون کھانے والوں اور بھنگ پینے والوں کے لیے شراب کے تذکرے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی جو جس کا طالب ہوگا، اسی کو یاد کرے گا، اسی کو یاد کرے گا۔ اسی کے ذکر میں لذت محسوس کرے گا، احساسات کی دنیا پر جو بھی چھایا ہوگا، اسی کی یاد آئے گی، اسی کا ذکر زبان پہ ہوگا اور اسی کی یاد لذتیں عطا کرے گی۔

بیمار جسم کو غذا کی لذت نصیب نہیں ہو سکتی، اور بیمار روح کو خدا کا نام لینے میں مزا نہیں آتا۔ تعلق ہی نہ ہو تو مزا کیسا؟ لگن ہی نہ ہو تو مستی کیسی؟ سو تیلی ماں کو بچہ لاکھ بار اماں کہہ کر پکارے، اس کی پکار بے اثر

ہوگی۔ نہ پکارنے والے کے دل میں کوئی مستانہ جذبہ پیدا ہوگا اور نہ ہی سننے والی ذات کی سماعت لذت گیر ہوگی دونوں لذت سے محروم رہیں گے۔ پکار وہی متاثر کر سکتی ہے، جو دل سے نکلی ہو۔ دل سے نکلی ہوئی صدا کبھی رائیگاں نہیں جاتی وہ اثرانداز ہو کر رہتی ہے۔ جذبات میں ہیجان اور طوفان پیدا کر دیتی ہے۔ احساسات کا ایک ایک تار ہلا دیتی ہے۔ سوز و درد سے محروم اجنبی آواز نے کب کسی دل میں محبت کے جذبات پیدا کئے ہیں اور اسے سوز و درد سے آشنا کیا ہے؟ آشنائی ہی آواز میں سوز پیدا کرتی ہے، اور سوز سے شناسا کرنے کا موجب ثابت ہوتی ہے۔ بیگانوں کی آواز میں اثر نہیں ہوتا۔ بندے کا بھی جب مولا سے رشتہ جڑ جاتا ہے تو آواز میں خود بخود سوز و درد پیدا ہونے لگتا ہے۔ یاد بھی مزا دینے لگتی ہے۔ اور پکار بھی۔ اور یہی پکار اسکی بارگاہ میں قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے

بیگانہ وار پکارنے سے نہ خود کو مزا آتا ہے۔ اور نہ یہ پکار حریم ناز کے پردوں میں کوئی جنبش پیدا کر سکتی ہے۔ دل سے نکلی ہوئی پکار کے ذریعے حریم جمال کے پردے بھی اٹھنے لگتے ہیں اور دل بھی لذات و کیفیات کا مخزن بن جاتا ہے۔ یہ سب لگن کے کرشمے ہیں، اور باہمی نسبت و تعلق کی معجزنمائی۔

نشہ اور کیف

دل میں ایمان موجود ہو تو مشکلات کا ہجوم بندے کو مولا کے قریب کر دیتا ہے۔ حرارت اور ایمان کی قوت سے محروم انسان کے لیے معمولی مصیبت بھی گوناگوں پریشانیوں کا موجب بن جاتی ہے۔ آگ سونے کے حسن کو نکھار دیتی ہے اور ملمع کا کھوٹ ظاہر ہو جاتا ہے۔

بارگاہِ صمدیت میں شرفِ قبول حاصل کرنے والا حسن وہ نہیں جس کی شمع کو حوادث کے جھونکے بجھا دیں۔ یہاں اس حسن کی پذیرائی ہوتی ہے، اسے شایانِ توجہ سمجھا جاتا ہے جو مصائب و آلام کی آندھیوں میں صابر و شاکر اور اپنے مالکِ حقیقی کا ثناخواں رہے اور یہ انسان کی فطرت ہی کا حسن ہو سکتا ہے جس پر کسی حال میں آنچ نہیں آتی۔ اس کے چمنستان میں مہکنے والے پھول سدا بہار ہوتے ہیں جن پر خزاں کا رنگ نہیں چڑھتا۔ خدا تعالیٰ کی ذات پر کامل بھروسہ رکھنے والے انسان حالات کی نیرنگی سے کبیدہ خاطر نہیں ہوتے۔ حوادث ان میں یاس پیدا نہیں کر سکتے وہ ہر غم، ہر مصیبت اور ہر پریشانی میں اپنے رب سے ربط قائم رکھتے ہیں جو انہوں نے اسے سمیع و بصیر اور قادر و قیوم مان کر قائم

کی ہوتی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ایک صدیق انسان اور ہوس کے بندے کے نظریات میں بنیادی طور پر یہ فرق ہوتا ہے کہ صدیق انسان محبوب کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو راہِ محبت کے ثمرات سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔ محبوبِ حقیقی کی ذات پر کامل بھروسے کے باعث مصائب کو بھی حکمتوں اور مصلحتوں پر محمول کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور جس شخص کے دل میں ایمان راسخ نہ ہو وہ ہر ناگواری کے پیش آجانے پر مضطرب ہو جاتا ہے۔ ذاتی اغراض اسے اس قدر مطلب پرست بنا دیتی ہیں کہ وہ زبان سے خدا تعالیٰ کے علیم و حکیم ہونے کا ذکر کرنے کے بعد بھی اپنی ہی مصلحتوں کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ خلافِ طبع امور پیش آنے کے باعث گھبراتا ہے۔ تلملاتا ہے اور پکارنے لگتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ گویا وہ بندہ ہو کر خالق کو اپنی مرضی کے تابع بنانا چاہتا ہے۔ اپنی رضا کو اس کی رضا پر فوقیت دیتا ہے۔ ایسا تعلق تو بندوں سے بھی نہیں نبھ سکتا۔ کسی بندے سے رشتۂ محبت استوار کرنے کے بعد اپنے کچھ عزیز ترین مفادات کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس کی رضا کے لیے اپنے مفاد نظر انداز کرنے پڑتے ہیں۔ تب کہیں جا کے دو دل جڑتے ہیں۔ محبت اور اعتماد کی فضا قائم ہوتی ہے۔ خود غرضی کے ساتھ قائم کیا ہوا تعلق تو بندے کے ساتھ بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ بیان

ذات اپنے عشق کو کب قابلِ توجہ سمجھتی ہے؟ اسے تو انہی سوختہ جانوں کا تعلق عزیز ہوتا ہے جو رضا کے بندے ہوتے ہیں۔ کوئی حادثہ ان کے تعلق کی پابندی کو کمزور نہیں کر سکتا۔ وہ تو مصائب میں بھی اس احساس سے خوش ہوتے ہیں۔ کہ انہیں شایانِ توجہ سمجھا گیا ہے۔

اس صحابیؓ کے متعلق آپ کیا رائے قائم کریں گے جسے مشرکین نے پکڑ کر مکہ میں سولی پر لٹکا دیا تھا اور وہ فرطِ مسرت میں جھوم جھوم کر عاشقانہ اشعار پڑھنے لگا تھا۔ ان جاں نثارانِ رسولؐ کے متعلق آپ کا نظریہ کیا ہے جو بدر حنین میں زخمی ہو کر گرتے وقت دوڑ کر حضورؐ کے قدموں پہ سر رکھ دیتے تھے۔ اور یہ کہہ کر ابدی نیند سو جاتے تھے کہ رب کعبہ کی قسم میں مراد کو پہنچ گیا۔

محبت کی مراد ارباب غرض کی مراد سے مختلف ہوتی ہے، دونوں میں کوئی تطابق نہیں ایک بامراد ہوتے ہیں اور ایک نامراد ایک کے مقدر میں راہِ محبت کے مزے ہوتے ہیں۔ اور ایک کی قسمت میں ہوس کی بے کیفیاں۔ ہوس کا پجاری محبت کا شہید نہیں ہو سکتا۔ دونوں کی راہیں مختلف ہیں۔

بصارت اور بصیرت

نقش سے محبت نقاش سے محبت کی دلیل ہوتی ہے تخلیق کے حسن و جمال کو نظر انداز کر کے نہ خالق کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے محبت قائم ہو سکتی ہے ہر تخلیق اپنے خالق کا آئینہ ہوتی ہے جس میں اس کی فنی لطافتوں اور عظمتوں کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے تخلیق کا مقصود ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ خالق کی طرف راہنمائی کرے۔ اس کی عظمتوں کو آشکارا کرے۔ نقش جب دل پر اپنی عظمت کا سکہ جما لیتا ہے تو نقاش کی عظمت خود بخود دل میں جاگزیں ہونے لگتی ہے اسی لیے قرآن میں جا بجا زمین و آسمان، چاند سورج، ستاروں، پہاڑوں، دریاؤں اور اسی نوع کی دوسری چیزوں کو غور سے دیکھنے کی تعلیم دی گئی ہے یہ تمام چیزیں آیاتِ الٰہیہ ہیں۔ رب تعالیٰ کی نشانیاں ہیں ان کے دیکھنے سے رب تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی قدرت و حکمت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی ذات کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ باطل کوئی چیز بھی نہیں۔ ہر تخلیق کا ایک مقصد ہے کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔ اس تک انسانی فکر پہنچے یا نہ پہنچے چاند سورج اور ستارے

بیکار نہیں بنائے گئے۔ دریا کو بلا وجہ روانی نہیں دی گئی پہاڑوں کو بلا وجہ جلال و جبروت عطا نہیں کی گئی ہوا کا خرام بلا سبب نہیں صحرا کے سکوت میں بھی ایک نغمہ ہے۔ جسے بیدار دل ہی سن سکتے ہیں۔ لیل و نہار کی گردشیں اور وقت کی کروٹیں ایک نیا پیغام لے کر آتی ہیں محبوب کے یہ قاصد نہ بلا سبب آتے ہیں نہ جاتے ہیں۔ گوشِ شنوا کوئی نہ ہو چشمِ بصیرت کوئی نہ کھلے تو قاصدوں کی دوڑ دھوپ کو غلط نہیں کہا جا سکتا جو دل ان قاصدوں کا پیغام سنتے ہیں انہیں بیداری نصیب ہوتی ہے جو آنکھیں آیاتِ الٰہیہ کو دیکھتی ہیں انہیں بصیرت ملتی ہے۔ بصیرت اور بصارت سے محروم انسان نہ کچھ دیکھ سکتا ہے۔ نہ عبرت حاصل کر سکتا ہے عبرت بصیرت اور بصارت کی مقتضی ہے۔ اور یہ دولت انہی لوگوں کو ملتی ہے جو ہدایت کے متلاشی ہوتے ہیں طلب سے سینہ خالی ہو تو سامنے پڑی ہوئی نعمتوں سے بھی استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ استفادے کے لیے طلب کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بھوکا انسان روٹی کے چند ٹکڑوں کو بھی نعمت سمجھ کر شکر ادا کرتا ہے۔ اور طلب سے محروم کے لیے اعلیٰ غذائیں بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتیں جس دل میں معرفت شناسی کا جذبہ موجود ہو۔ اس کیلئے درختوں کے سبز پتے بھی معرفت کے دفتروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک ایک شاخ، ایک ایک پتہ اور ایک ایک کونپل جہانِ معرفت کی طرف

رہنمائی کرتی ہے۔ دنیا کی نگاہوں میں وہ شخص ذی عزت قرار پاتا ہے جو خلاق ذہن کا مالک ہو جو نئی نئی اختراعات کرے۔ دنیا کا دامن اپنی ندرت کاریوں سے بھر دے لیکن خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ شخص عزت دار سمجھا جاتا ہے جس کا دامن پاک بازی کی نعمت سے مالا مال ہو خواہ اس نے زندگی بھر کوئی اختراع نہ کی ہو۔ دنیا کے سامنے کسی خوش گفتاری کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ قرآنی نظریئے کے مطابق وہ تمام انسان گمراہ تھے جن کے دامن میں فہم و فراست کی متاع تو موجود تھی لیکن انہوں نے انبیاءؑ کی تعلیم کو قبول نہ کیا۔ ان کی بتائی ہوئی راہ پہ نہ چلے۔ لق و دق صحرا میں سفر کرنے والا انسان خواہ کتنی بھی ذہانت کا ثبوت دے۔ کتنی بھی ندرت کاریوں کا مظاہرہ کرے۔ اگر وہ بروقت منزل پر نہ پہنچے، مقصود سے غافل ہو کر اپنی توجہ دوسرے امور پہ صرف کر دے۔ تو ہولناک آندھیوں اور تباہیوں کی نذر ہو کر رہ جائے گا۔ ایسے انسان کو منزل رسیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ منزل انہی کو ملتی ہے جن کی نظر منزل پر ہو جو منزل کو مقصودِ حیات سمجھیں۔ خواہ راہ میں ان سے تعجب خیز امور کا صدور نہ بھی ہو۔ آخرت میں انسان سے ذہانت کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا۔ اعمال کی پرسش ہو گی یہ سوال کیا جائے گا کہ اس منزل کے لیے کیا لائے ہو؟

بارگاہِ جمال

اہلِ دنیا کی تمام تر توجہ دنیوی مال و منال کی حفاظت و صیانت پر مرکوز ہوتی ہے۔ جان دے کر بھی متاع مال کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔ ایمان جیسی دولت دے کر بھی اگر وہ یہ سمجھیں کہ مال کی حفاظت ہو سکتی ہے تو اس تجارت کو خسارے کا سودا نہیں سمجھتے۔ اہلِ آخرت کو ایمان عزیز ہوتا ہے اس لیے وہ ایمان کی حفاظت کو اپنا اوّلین فرض جانتے ہیں اور ان کی ساری کوششیں اسی فرض کی تکمیل کے لیے صرف ہوتی ہیں۔ جان و مال کا زیاں ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا ایمان پر آنچ آجائے تو ان کی دنیا تاریک ہو جاتی ہے ان کا دل صبر و سکون کی دولت سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایک عارف کے حالات میں مذکور ہے کہ انہیں مصیبت میں مبتلا دیکھ کر کسی نے اظہارِ تاسف کیا تو فرمانے لگے کہ الحمد للہ، مصیبت میں مبتلا ہوں، معصیت میں نہیں۔ اہلِ ایمان کے نزدیک مصیبت میں مبتلا ہونا کوئی بات نہیں، مصیبت کو وہ تقربِ الٰہی کا ذریعہ جانتے ہیں اور اپنے رب سے اس کے اجر و ثواب کے امید وار ہوتے

ہیں۔ معصیت کا ارتکاب ان کے نزدیک عظیم بلا کی حیثیت رکھتا ہے وہ اسی
کا ماتم کرتے ہیں، اسی پر مضطرب ہوتے ہیں اور اسی سے نجات حاصل کرنے
کے لیے بارگاہِ صمدیت میں ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ مصیبت میں انہیں قناعت
نصیب ہوتی ہے جب مصیبت میں انسان کا دل مطمئن ہو اسے صبر و سکون
کی دولت نصیب ہو، وہ خدا کا عذاب نہیں رحمت ہوتی ہے۔ انجام کار اس
کے درجات میں اضافہ کرتی ہے۔ مصیبت وہ وبال ناک ہوتی ہے جس میں مبتلا
ہونے کے بعد انسان کے ہاتھ سے صبر و سکون کا دامن چھوٹ جائے اور
وہ عقل و شعور سے بیگانہ ہو کر قلق و اضطراب کا اظہار کرنے لگے۔ مصیبت
کے رحمت اور زحمت ہونے کا معیار انسان کا وہ حال ہوتا ہے جو اس
کی باطنی کیفیات کا اظہار کرتا ہے۔ کیفیت سکون پذیر ہو تو یہ رحمت کی
دلیل ہوتی ہے خدا کی رحمت شاملِ حال نہ ہو تو مصیبت میں صبر کی توفیق
نہیں ملتی۔ صبر کی توفیق انہی کو ملتی ہے جنہیں مصیبت کے ذریعے بندگانِ
خاص میں شامل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس طرح اہلِ دنیا پر اپنے خاص بندوں
کی عظمت آشکارا کی جاتی ہے اور انہیں بتایا جاتا ہے کہ ہمارے بندے
ابتلا و امتحان میں مبتلا ہونے کے باوجود کس قدر صابر و شاکر ہیں، ان کی
زبان شکوہ و شکایت سے آلودہ نہیں ہوتی، ہمارے ساتھ انہوں نے
جو رشتہ قائم کیا ہے وہ کسی حال میں نہیں بدلتا۔ احوال کا تغیر جذبات

کے کیف و کم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ رنج و راحت میں انسان کے جذبات و خیالات بدلتے رہتے ہیں۔ تو حال ان سے اثر پذیر ہوتا ہے وضع میں بھی اسی لیے تغیر پیدا ہونے لگتا ہے۔ خاصانِ بارگاہ کے احوال کو زمانے کے تغیرات منقلب نہیں کر سکتے ان کے احوال میں جو بھی تغیر واقع ہوتا ہے۔ وہ محبوبِ حقیقی کے مزاج کے تغیر کا اشارہ و نتیجہ ہوتا ہے۔ مصیبت میں بھی انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ خدا تعالیٰ ان سے خوش ہے۔ رضا کی دولت انہیں نصیب ہے تو شدائدِ زمانہ کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ طبیعت میں اضمحلال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب انہیں یہ گمان گزرنے لگے کہ محبوبِ حقیقی کی نظر ان سے پھر گئی ہے، وہ ان سے خوش نہیں، یہی احساس انہیں مضطرب کرتا ہے۔

دنیا کے طالب کی نظر خدا کی رضا پر نہیں ہوتی، وہ مال و دولت کا طلب گار ہوتا ہے اور اسی آرزو میں زندگی گزار دیتا ہے۔ آرزوؤں کے بت متشکل ہو کر سامنے آ جائیں تو وہ ان کی پوجا میں لگ جاتا ہے انہی معبودوں کی پرستش میں اس کی زندگی بسر ہونے لگتی ہے اور اسے یہ احساس تک باقی نہیں رہتا کہ خواہشات کے یہ لات و منات اسے خدا کی بارگاہ سے کس قدر دور لے آئے ہیں۔ بتوں کے قرب کو وہ خدا کے قرب پر ترجیح دیتا ہے۔ انسان کی جبیں جب خواہشات کے لات و

منات کے سامنے جھکنے لگے تو اسے خدا کی بارگاہ کے سجدوں کی لذت نصیب نہیں ہوتی بارگاہ قدس کے سجدوں کی لذت انہی دلوں کو نصیب ہوتی ہے جن میں عشقِ الہٰی کی آگ فروزاں ہو جن میں طلب ہو تو اسی ذات کی جو خالق حسن وجمال ہے۔ تڑپ ہو تو وہ بھی اسی کی رضا کی، قلق و اضطراب ہو تو اس کا پروردگار بھی عشقِ الہٰی کا کوئی فروزاں اور تاباں جذبہ ہو۔ دنیا کے غم تو ہر انسان کو پریشان کرتے ہیں لیکن عقبےٰ کا غم انہی دلوں کو نصیب ہوتا ہے جنہیں خدا تعالیٰ اپنی محبت کے فیوض کے لیے مخصوص کر لیتا ہے۔ وہ ذات بڑی غیور ہے۔ خواہشات کے بتوں کے پجاریوں کو اپنی محبت کا غم ودیعت نہیں کرتی۔ یہ دولت انہی کو تفویض ہوتی ہے جنہیں اپنا سمجھا جاتا ہے اور انہیں اس امانت کا اہل خیال کیا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے مقبولوں کو وہ غم دونوں جہان کی راحتوں سے عزیز ہوتا ہے جو واصل ذات کر دے محبوب حقیقی کے قرب سے نواز دے۔ وہ ان راحتوں کو عذاب الیم جانتے ہیں جو انکے اور مالک حقیقی کے درمیان حجاب بن جاتی ہیں۔ حجاب دوری میں ہے قرب میں نہیں۔ قرب نصیب ہو تو کوئی حجاب نہیں ہوتا حجاب باقی ہوں تو قرب کی تمنا بے کار رہتی ہے۔ حجاب نام ہے اپنی آرزوؤں کی ان طلسم بندیوں کا، جن کی چمک دمک انسان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے اور وہ رضائے الہٰی کے حسن وجمال کو دیکھنے سے محروم رہ جاتا ہے۔ خواہشات مٹ جاتی ہیں۔ آرزوؤں کا

طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور اپنی رضا، رضائے دوست میں فنا ہو جاتی ہے۔ کوئی حجاب نہیں رہتا۔ قرب بھی عطا ہوتا ہے اور جمال بھی، لذتیں بھی، اور سرمستیاں بھی، کیفیتیں بھی اور کیف بار ساعتیں بھی، یہ سب فیضانِ جمال کی معجز نمائیاں ہیں۔ محجوب انسان کو اس بارگاہ میں کہاں دخل نصیب ہو سکتا ہے؟

خواجہ اور شبلی

تعلق باللہ کا صحیح لطف انہی لوگوں کو حاصل ہو سکتا ہے جن کی طلب کے زاویے درست ہوں۔ تاجر نہ محبت کی بو سونگھ سکتا ہے نہ کسی دوسری طرح میں مستی اور سرشاری پیدا کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے تعلقات کی اساس لین دین پر ہوتی ہے مستی اور سرشاری لین دین کا خاصہ نہیں۔ اس کا تعلق روحانی روابط سے ہے جہاں روح کا تعلق ہوگا مستی بھی ہوگی اور روح کیف و سرور کے عالم میں مست و سرشار بھی رہے گی۔ تعلق جس نوعیت کا ہوگا ویسے ہی اثرات مرتب ہوں گے۔ باغ میں عطار، مالی اور شاعر کا گزر ہو تو پھولوں کے حسن و جمال اور ان کی بو باس سے ہر ایک جداگانہ اثر قبول کرے گا۔ عطار عرق کھینچنے کے نقطۂ نگاہ سے دیکھے گا، اسے وہ کیفیت حاصل نہ ہوگی جو شاعر کی روح پر مدہوشیاں طاری کر دے گی۔ مالی

ان کے تعلق قلب سے شعر کے نغمے پیوستہ ہیں گے۔ دل کا اپنا اندازِ فکر ہوگا۔
ایک ہی پھول کا جمال مختلف انسانوں میں مختلف کیفیات پیدا کرنے کا موجب
ہو جاتا ہے۔ ان کے اختلاف سے پھول کے اثرات بھی بدل جاتے ہیں
قلب کے زاویوں کے مختلف ہونے کے باعث ہر شخص نے جداگانہ اثر
قبول کیا۔ غرض اگر یہ کہے کہ جو کیفیتیں شاعر کو نصیب ہوئی ہیں ان سے مجھے
حصہ کیوں نہیں ملا؟ تو یہ اس کی بھول ہوگی کیفیتیں صرف محبت کے عطا ہوتی
ہیں۔ تعلق کی جیسی نوعیت قائم کی جائے ویسا اثر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

نشاطِ درد ہی میں اور تکلیفِ تمنا بھی!
حقیقت میں وہ ہیں دیدہ و دل جیسا گماں کر لیں

اسی لیے بندے کو معاملاتِ تعلق قائم کرنے سے پہلے قلب کے اندر
درست کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایمان کیا ہے؟ یہ تعلقات کی درستگی
اور استواری ہی کا نام تو ہے۔ وہ پیمانِ محبت جو اپنی عبودیت کے اعتراف
اور اس کی حاکمیت کے احساس کے ساتھ بندہ مولا سے باندھ لیتا ہے
اسی کو ایمان کہتے ہیں اور اعمالِ صالحہ اسی کا نتیجہ اور ثمر ہوتے ہیں۔ خالق
تو خیر ایک بے نیاز ذات ہے تمام مخلوق اس کی مطیع و فرماں بردار بن جائے
تو اس کی خدائی کی لامحدود وسعتوں میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہو سکتا اور نہ
کوئی باغی بن کر اس کو کچھ نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ایک معمولی درجے کے انسان سے

بھی اس شرط پر تعلق قائم نہیں رہ سکتا کہ اسے ہر مطالبہ تسلیم کرنے کے لیے مجبور کیا جائے، ہر آرزو کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جائے۔ ایسے تعلقات میں نہ استواری قائم رہ سکتی ہے، نہ انہیں محبت کے لیے سرمایۂ نازش سمجھا جا سکتا ہے۔ محبت کے لیے وہی تعلقات سرمایۂ نازش و افتخار سمجھے جا سکتے ہیں جن کی اساس خلوص پر مبنی ہو جہاں اپنے مفاد سے زیادہ سامنے والی ذات کی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کا احساس موجود ہو صحابہؓ کے متعلق قرآن میں یہ جو کہا گیا ہے کہ ہم ان سے راضی ہو گئے اور وہ ہم سے راضی ہیں۔ تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان نفوسِ قدسیہ نے ایمان لانے کے بعد اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی بساط لپیٹ کر رکھ دی تھی ان کے سامنے ایک ہی مقصد تھا۔ اور وہ یہ کہ ہر چیز کی قربانی دے کر وہ خدا کو راضی کرنا چاہتے تھے۔ جہاں سامنے والی ذات کی رضا مقصودِ حیات بن جاتی ہے، وہاں اپنی رضا کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ دوسرے کی رضا کے ساتھ ساتھ اگر اپنا مفاد بھی عزیز ہو، تو اسے پیمانِ محبت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ خالصتاً کاروباری تعلق ہوتا ہے، اور ازل سے محبت کی یہ ریت ہے کہ وہ سرِ مو بھی غیر کی شرکت گوارا نہیں کرتی۔ مفاد کا ہلکا سا تصور بھی آ جانے سے یہ آئینہ گدلا جاتا ہے۔ اس کی نقشِ ونگار ہی بے رنگ رہتے ہیں ہے اس گلستان میں تو بہار ہی اس وقت آتی ہے جب آرزوؤں اور تمناؤں کا خون پیش کیا جاتا ہے۔ اپنے احساسات کی قربانی دینے کے بعد

محبت کے دل میں جگہ مل سکتی ہے اور انسان جب بارگاہ محبت میں سرخرو اور کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کی عظمتوں کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔ ہوس باریابی عت کرنے کے بعد دھتکار دیتی ہے۔ اس کا تعلق اسی وقت تک کیلئے ہوتا ہے جب تک اس کی مطلب برآری ہوتی رہے محبت کا یہ قانون نہیں وہ خود مقبول ہے اور اس کا چاہنے والا بھی مقبول و محبوب ہوتا ہے۔

تجلیات

جسم و روح کے اتصال کا نام زندگی ہے اور ان دونوں کی مفارقت کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے جسم اسی وقت تک زندہ کہلا سکتا ہے جب تک اس میں روح جاری و ساری ہو۔ روح نکل جانے کے بعد جسم بیکار ہو جاتا ہے۔ اس میں زندگی کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی اور نہ ہی اس سے کسی ایسی حرکت کی توقع کی جا سکتی ہے جو خالصتہً روح کا فیضان ہو جس طرح جسم کی حیات روح پر موقوف ہے ایسے ہی دل کو یاد الٰہی سے زندگی ملتی ہے۔ محبت الٰہی دل میں موجود ہو تو دل زندہ رہتا ہے اور اس سے ان تمام امور کا صدور ممکن ہوتا ہے جو زندہ دل کے لوازمہ کہلا سکتے ہیں۔ کیفیت وہ بھی زندگی اور توانائی

کھلاڑی مرجھاتے ہیں۔ جوانی کا نشہ اور تازہ خون کا طغیان ان چیزوں کا خالق
ہوتا ہے۔ ضعف و نقاہت کے باعث انسان جب نیم مردہ ہو جاتا ہے
تو اس سے کسی عظیم کارنامہ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ حیات کا نشہ اور زندگی
کا کیف و سرور ہی انسان کو جانبازیوں اور سرفروشیوں پر آمادہ کر سکتا ہے۔

دل کی حیات کا بھی یہی حال ہے، اسے بھی یادِ الٰہی سے زندگی نصیب
ہو تو وہ زندہ کہلا سکتا ہے اور اس سے زندگی کے آثار ظاہر ہو
سکتے ہیں۔ خدا کی محبت کے نکل جانے کے بعد وہ صرف گوشت کا لوتھڑا
رہ جاتا ہے اور ایسے لوتھڑے کو دل کہنا صحیح نہیں۔ گوشت کا لوتھڑا تو
حیوانوں میں بھی موجود ہوتا ہے۔

مومن کا دل جو عرشِ الٰہی ہے جس سے حیات کیف گیر ہوتی ہے،
جو حیات افروز اور حیات آفریں ہے، اسے گوشت کے لوتھڑے سے
کیا نسبت؟ گوشت کا لوتھڑا تو روح نکل جانے کے بعد زیادہ دیر تک
ٹھہر نہیں سکتا۔ اور کوئی سلیم الفطرت انسان اس کے قریب نہیں پھٹک
سکتا۔ رب تعالیٰ سے یہ کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ایسے بدبودار ٹکڑے
کو اپنی جلوہ گاہ بنائے گا۔ اور اسے عرشِ الٰہی کہا جائے گا۔

عرشِ الٰہی تو یہ اس وقت بنتا ہے جب یہ مطلق کے معبود ر
سکتا ہے جو اس مکان کی زیب و زینت اس کے مکین کی موجودگی سے ہے۔

لگایا جا سکتا ہے، جس گھر میں چاروں طرف گندگی کے انبار پڑے ہوں۔ اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی ٹھہرنا دشوار ہو، اس کے متعلق یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کوئی لطیف مزاج قیام کرے گا؟ اچھے مکین کو بسانے کے لیے گھر کا غلاظتوں سے پاک ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جیسا مکین بسانا مقصود اسی نسبت سے گھر کی صفائی بھی ضروری ہوتی ہے۔ بعض لوگ مکان کرایہ پر دیتے وقت غایت درجہ کی لطافتوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ انہیں پارٹنرشپ بھی منظور نہیں ہوتی۔ انسان بھی عجیب واقع ہوا ہے۔ وہ دل کو غلاظتوں سے پاک کرنے کے لیے بھی تیار نہیں اسی دل میں اس نے شیطان کو بھی بسا رکھا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ اسی میں خدا بھی آموجود ہو۔ قاعدے اور دستور کی بات ہے کہ ایک کے آنے کے لیے دوسرے کو جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ دو متضاد قوتیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دل نفرت کا مقام بن کر رہے گا، یا محبت کی جلوہ گاہ، نفرت شیطان کی میراث ہے، اور محبت تجلیات باری کا پرتو۔ دونوں کی ایک جگہ گنجائش ممکن نہیں۔

جس ذات سے تعلق قائم ہو اس کی میراث بن کر رہتی ہے۔ شیطان سے تعلق ہو تو صفات میں اسی کے اثر کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ رحمٰن سے رشتہ قائم ہو جائے تو حیات رحمانی صفات سے متصف ہو کے

بغیر نہیں رہ سکتی تعلق جیسا ہو گا، اثر بھی ویسا ہی ظاہر ہو کر رہے گا اب یہ انسان کے اپنے ذوق پر موقوف ہے کہ وہ ربانی صفات سے متصف ہو کر حیات کو خوشگوار بنا لے یا شیطان کی اقتدا میں خسارے کا سودا قبول کرے۔ اختیار اسے دونوں کا دے دیا گیا ہے۔

چند نظائر

ایمان قلبی تصدیق کا نام ہے۔ زبانی اقرار تو محض علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کی صداقت کی تاب شہادت دے تو اسے ایمان کہا جائے گا۔ زبان سے اقرار کرنے کے بعد جن لوگوں نے استقامت اختیار کی۔ قرآن انہی کی تعریف کرتا ہے جو لوگ زبان سے اقرار کرتے تھے اور ان کے دل اسلام کی صداقت پر مطمئن نہ تھے، انہیں منافق کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ نظریہ خواہ کوئی بھی ہو، اس کا زبانی اقرار کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔ تا آنکہ انسان اس کے لیے قربانی دینے پر آمادہ نہ ہو، شہید کے مقام و مرتبہ کی اسی لیے تعریف کی گئی ہے کہ وہ اپنے عمل سے اسلام کی صداقت کی شہادت دیتا ہے۔ صحابہؓ کو بھی جو اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ انہیں اپنی زندگی میں حضورؐ کی شہادت

کے جو مواقع نصیب ہوئے، انہوں نے ان کے ایمان کو اس قدر مضبوط
اور مستحکم بنا دیا کہ قرآن ان کا قصیدہ خوان بن گیا۔ آج کی مہذب دنیا کو ایمان
کے دعویٰ کے باوجود اسلام کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا
ہوتے ہیں لیکن عرب کے صحرا نشینوں نے حضورؐ کو خدا کے رسول کی حیثیت
سے تسلیم کر لیا تو ان کے دل ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہو گئے۔ معرکہ
خندق کے وقت مسلمانوں کی کیا حالت تھی؟ کفار اپنی پوری طاقت کے ساتھ
حملہ آور ہوا تھا اور وہ اپنی حفاظت کے لیے مدینہ کے گرد خندق کھود رہے
تھے۔ خندق کھودتے وقت جب ایک چٹان نکل آئی تو صحابہؓ نے اپنی
مشکل کا حضورؐ سے ذکر کیا۔ حضورؐ نے کدال سے کر تین ضربوں سے چٹان توڑ دی
اور اس کے بعد صحابہؓ کو شام، روم اور ایران کے فتح ہونے کی بشارت
دی۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ کدال کے چٹان پر لگنے سے جو روشنی نکلی تھی
اس میں میں نے شام و روم کے محلات بھی دیکھے ہیں۔ ایران کے
ہونے کے بعد جو فتوحات تمہیں نصیب ہوں گی۔ کدال لگنے سے پتھر
سے نکلنے والی روشنی میں میں نے ان فتوحات کا مشاہدہ بھی کر لیا۔ شاہ
ایران کی شان کے کنگن بھی دیکھ لیے ہیں۔ شہزادی کے کنگن ہمارے
ایک سپاہی سراقہؓ کو پہنائے جائیں گے۔

زبانِ نبوت سے یہ بشارت سن کر حتیٰ کہ منافقین حضورؐ کی

تصدیق کی۔ ایک صحابی کو بھی یہ شبہ نہیں ہوا کہ مدینہ جو ایک مختصر سی بستی ہے، جسے ہم نے جائے پناہ کی حیثیت سے اختیار کیا ہے اس میں تو ہماری جانیں محفوظ نہیں۔ روم و شام اور ایران کی عظیم سلطنتوں کو ہم کیسے فتح کر سکتے ہیں! پتھر سے نکلنے والی روشنی میں حضورؐ نے شام و روم اور ایران کے محل کیسے دیکھ لیے؟

صحابہؓ نے دل سے حضورؐ کی تصدیق کی۔ آج بعض لوگ معجزاتِ نبوی سے انکار کرتے ہیں۔ معراجِ جسمانی و شقِ قمر کا ذکر سن کر بھی ناگن کی طرح بل کھانے لگتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ مدینہ کے محصور مسلمانوں کو دنیا کے عظیم ترین ممالک کے فتح ہونے کی بشارت دینا شق القمر کے معجزے سے کیا کم ہے؟

شام، روم اور ایران کے مقابلے میں اس وقت مدینہ کی وہی حیثیت تھی جو آج کی دنیا میں امریکہ، برطانیہ اور روس کے مقابلے میں کسی معمولی سی بستی کی ہو سکتی ہے۔ صحابہؓ کو یقین تھا کہ حضورؐ نے جو فرمایا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ صحابہؓ نے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ جن فتوحات کی بشارت دی جا رہی ہے وہ ہمیں کب نصیب ہوں گی؟ حالانکہ ان کی پریشان کن حالات اس امر کا تقاضا کرتے تھے کہ وہ پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے آسودگی کی آرزو کریں۔ کم از کم یہی کہہ دیا ہوتا کہ حضورؐ دعا فرمائیے یہ فتوحات جلد نصیب ہوں تاکہ افلاس و غربت سے نجات

حاصل ہوئے لیکن اس باب میں ان کی مکمل خاموشی اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک اصل چیز نہ فتوحات تھیں اور نہ آسودہ زندگی، خدمتِ اسلام اور طاعتِ رسولؐ ان کا مقصودِ حیات تھی - بیکار باتوں کے لیے زبان اسی وقت کھلتی ہے جب قوتِ عمل اور اطاعت کا جذبہ مفقود ہو، عشق ایسی باتوں کی کہاں اجازت دیتا ہے؛ اس کی تو فطرت ہی تسلیم و رضا ہے۔

لذتیں اور راحتیں

انسانی عظمت کا جو معیار دنیا والوں نے قائم کر رکھا ہے وہ خدا تعالیٰ کے اس قائم کردہ معیار سے یکسر مختلف ہے جس کی بنا پر بندہ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول قرار پاتا ہے۔ اہل دنیا کی نظر میں ہر وہ انسان محترم و معزز اور ذی عظمت ہوتا ہے جس کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہو، اونچی اونچی بلڈنگیں ہوں، ہر وہ چیز موجود ہو جو انسان کی دنیوی حیات کو خوشگوار بنا سکے۔ دنیا والوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ راحت کے یہ سازوسامان اس نے کن ذرائع سے حاصل کئے ہیں۔ اس کی یہ تمام عشرت کوشیاں اور عشرت کے سازوسامان ربانی قوانین سے بغاوت اور انحراف کا نتیجہ تو نہیں۔ قوانینِ فطرت کی پابندی کے بعد تو اس نے یہ سامان حاصل نہیں کیے؟

اگر خدا تعالیٰ کی نافرمانی کا نتیجہ ہوں، تو اسلام کی نگاہ میں یہ خسارے کا سودا ہوتا ہے، ایسا انسان نہ خدا کی نگاہ میں مقبول بن سکتا ہے۔ اور نہ ہی اس کے محبوب علیہ السلام کی بارگاہ مقبولیت کی سند حاصل کر سکتا ہے مقبولیت اور محبوبیت کی سند صرف انہی لوگوں کو ملتی ہے جو خدا تعالیٰ اور اس کے حبیب اکرم کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن ہو کر اپنے دامن میں ابدی سعادتیں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں خواہ ان کا دامن ازار دنیا سے خالی ہو۔ اور راحت و سکون کا کوئی لمحہ انہیں نصیب نہ ہو سکے۔ ان کے لباس کی بوسیدگی اور ان کی حیات کی بے سروسامانی اہلِ دنیا کے نزدیک خواہ کتنی بھی ناقابلِ التفات کیوں نہ ہو وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک مکرم و محترم ہوتے ہیں۔ بارگاہِ صمدیت سے انہیں مقبولیت کی سند عطا ہوتی ہے، اور ان کا رتبہ قدسیوں سے فزوں ہوتا ہے۔ ایسے انسانوں کو خدا تعالیٰ اپنے اس عظیم کرم سے نوازتا ہے کہ انہیں کچھ نہ ہونے کے باوجود محرومی کے احساس سے دوچار نہیں ہونے دیتا۔ رضوانِ الٰہی کی جو سند انہیں ملتی ہے وہ ان کی ڈھارس بندھاتی ہے، وہی طمانیت کا احساس بن کر روح و قلب میں پیوست ہو جاتی ہے اور وہ فقیری میں وہ مزے لوٹتے ہیں جو شاہوں کو نصیب نہیں ہوتے۔

خوشی اور غم کا تعلق مادی ساز و سامان کی فزونی سے نہیں، طمانیت خالصتاً عطیۂ ربانی ہے۔ بعض لوگ سب کچھ ہونے کے باوجود حقیقی

مسرت سے محروم رہتے ہیں اور بعض کچھ نہ ہونے کے باوجود بھی سکون کی دولت سے بہرہ ور کہلاتے ہیں۔ روحانی تسکین اور حقیقی مسرت اگر جنسِ بازار ہوتی تو یہ جنس غریبوں کے دامن تک نہ آتی۔ سرمایہ دار اور منافع خور اسے خرید کر اپنے دامن میں ڈال لیتے۔ لیکن جو خدا تعالیٰ اس کائنات پر بے لاگ قانون کے ساتھ فرمانروائی کر رہا ہے۔ انسانی عقل و شعور اس کی مصلحتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے جہاں اس کے حکم کی مصلحتیں کارفرما ہوں۔ وہاں محدود ذہن رکھنے والے انسان کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ انسان تو ابھی تک اپنے ہی خیر و شر کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھ سکا۔ اس کی ان حکمتوں کو کیسے سمجھ سکتا ہے جن کا تعلق اس کے فہم و ادراک کی دسترس سے باہر ہے۔

حیات کی خوشگواریوں اور ان کی تمام تر لذات کو اس علیم و حکیم اور قادر و قیوم ذات نے انسانی عقل کی تمام تر طرفہ کاریوں کے باوجود ابھی تک جنسِ بازار نہیں بننے دیا۔ یہ چیزیں بکاؤ مال نہیں۔ یہ جنس صرف ایک ہی دکان سے مل سکتی ہے۔ اور وہ اس کی مشیت اور ارادے کی دکان ہے جہاں اس کا ارادہ کارفرما ہو۔ وہاں مسرتیں ہوتی ہیں، لذات ہوتی ہیں کیف و سرور ہوتا ہے۔ اور ذوق و شوق کی جنس کی نہایت درجہ ارزانی ہوتی ہے۔ آنسوؤں کی فراوانی میں بھی ایک ہی مسرت انسان وہ لذات حاصل کر لیتا ہے جو قہقہوں کے بازار میں نہیں ملتیں۔ قہقہوں میں بھی

انسان زندگی کا صحیح لطف نہیں اٹھا سکتا اور آنسوؤں کی رِم جھم میں سے طمانیت نصیب ہو جاتی ہے۔ طمانیت رضوانِ الٰہی کا ثمرا ور نتیجہ ہوتی ہے۔ مصیبت میں انسان کی جو ڈھارس بندھ جاتی ہے اسے جو سکون حاصل ہوتا ہے اور اسے مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے جو تاب و تواں ملتی ہے آخر وہ کیا چیز ہے؟ وہ کرم ہی تو ہوتا ہے جو طمانیت کا احساس بن کر روح کو نئی زندگی عطا کرتا ہے اور یہی کرم روح کو سرشاریوں سے دوچار کر دیتا ہے۔ لذت اور سرشاری تعلق کے استحکام کا نتیجہ ہوتی ہے جس ذات سے تعلق ہو۔ اس کے ساتھ مصائب کی زندگی گزارنے میں بھی مزا آتا ہے اور جہاں تعلق نہ ہو وہاں راحتیں بھی مزا نہیں دیتیں۔ صحابہؓ کا چونکہ حضور حضورؐ کی ذات سے تعلق تھا، اس لئے انہیں مصیبت میں بھی مزا آتا تھا۔ قرب کی سرشاریوں کی لذتیں ان کے مصائب کے احساس کو ختم کر دیتی تھیں اور انہوں نے مصائب کی زندگی میں اس احساس کو کبھی قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ کہ ماضی میں زندگی کیسے آرام سے گزرتی تھی؛ وہ نبیؐ کی راحتوں پر ان مصائب کو ترجیح دیتے تھے۔ جو انہیں اسلام لانے کے بعد بارگاہِ نبوتؐ سے وابستہ ہو کر پیش آ رہے تھے۔

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

درد اور دوا

ایک ہی غذا مختلف انسان کھاتے ہیں لیکن مزاج کی نسبت سے وہ خون پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مزاج اگر صفراوی ہو تو وہ غذا کو صفرا میں ڈھال دیتا ہے۔ سوداوی مزاج انسان کے جسم میں غذا کھانے کے بعد سودا کا اضافہ ہونے لگتا ہے، اور بلغمی مزاج میں غذا پہنچ کر بلغم بن جاتی ہے۔ بچہ، بوڑھا اور جوان بھی ایک ہی غذا سے مساوی طور پر مستفیض نہیں ہوتے۔ بچے کا معدہ مرغن غذا کو ہضم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ جوان کے جسم میں پہنچ کر وہی غذا تازہ خون بن جاتی ہے، اور اس کی رگوں میں جوانی کا نشہ بن کر دوڑنے لگتی ہے، بوڑھے اور بیمار جسم میں اسی غذا سے کئی خرابیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ غذا پر ہی کچھ موقوف نہیں، قدرت کے مختلف اور رنگا رنگ مناظر سے انسان مختلف اثر قبول کرتا ہے۔ قوسِ قزح کی رنگینیاں اور پھولوں کی دل آویزیاں ایک شاعر مزاج انسان کی روح کو مست و سرشار کر دیتی ہیں، اور ذوقِ سلیم سے محروم انسان ان کے قریب سے گزر جاتا ہے، نہ اس کی روح میں کوئی مستی

پیدا ہوتی ہے، اور نہ ہی ان کا جمال اس کی طبع میں کوئی شگفتگی پیدا کر سکتا ہے۔ چکور کو بعض لوگوں نے چاندنی رات میں مست و سرشار دیکھا ہے اور اس کے دلنواز نغمے سنے ہیں۔ چاندنی چکور کی قلبی کیفیتوں کو جس انداز سے بیدار کرتی ہے، وہ صرف اسی کا حصہ ہیں۔ زاغ و زغن چاندنی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ نور خواہ کسی رنگ میں ہو، انہی لوگوں کو متاثر کرے گا جن کے ضمیر پاک ہوں، جن کی نگاہیں روشن ہوں، اور جنہیں نور سے ازلی مناسبت ہو۔ مناسبت کے بغیر نہ حسن مزا دیتا ہے نہ نغمہ، زاغ و زغن کی بے کیفیوں سے چاندنی کے حسن کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، چاندنی کے حسن کو سمجھنے کے لیے چکور کی کیفیتوں کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے نور محمدی کو صدیق و فاروق کے آئینے میں دیکھا ہے، انہیں مستیاں بھی ملی ہیں۔ اور سرشاریاں بھی۔ البتہ جن کی میراث پانے والوں کی نگاہوں پر ہمیشہ حجاب رہا ہے، وہ حجابات میں پیدا ہوئے ہیں، اور حجاب ہی میں مر جائیں گے۔ حجب ہی ان کا مقدر رہے۔ ان کی قیل و قال کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ قیل و قال کو محبت ختم کرتی ہے۔ محبت جب دل میں جا گزیں ہو جاتی ہے، قیل و قال نہیں رہتی۔ اطاعت ہوتی ہے، فرمانبرداری ہوتی ہے اور دل محبت کے جذبات سے لبریز رہتا ہے۔ عقل شکوک و شبہات کا دامن پھیلاتی

ہے۔ بحث و تکرار کا آغاز کرتی رہتی ہے۔ اور اس سلسلے کو وسیع سے وسیع تر کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ قیل و قال کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو، یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے۔ لیکن محبت بحث و تکرار کے تمام دفتر سمیٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اسے اطاعت میں مزا آتا ہے کیفیتیں ملتی ہیں، سرشاریاں عطا ہوتی ہیں، اور مستیوں سے دل لبریز رہتا ہے۔ ذوق و شوق کی دنیا کے دروازے عقل پر ہمیشہ بند رہے ہیں۔ اسے اس باغ کی بو سونگھنا نصیب نہیں ہوئی۔ محبت نے ہمیشہ محبت کے لیے دروازے کھولے ہیں۔ محبت، محبت کی منتظر رہی ہے۔ محبت نے محبت کی ہم آغوشی کے مزے لوٹے ہیں، حال سنا ہے تسکین دی ہے وہ تسکین بن کر دل میں سمائی ہے، نصرت بن کر میدانوں میں آئی ہے، زخمی دلوں پہ مرہم رکھا ہے، بیمار دل کا مداوا کیا ہے اور تسکین سے محروم دلوں کو تسکین بخشی ہے۔ محبت بھکاری بن کر محبوب کے دروازے پر آئی ہے تو کبھی نامراد نہیں لوٹی۔ یہ طلب سے سوا ملا ہے۔ توقع سے زیادہ کرم کی مستحق قرار پائی ہے۔ قرار اس کا حصہ ہے۔ تسکین اس کی دولت ہے، اعتماد اس کا سرمایہ ہے۔ یہاں بھی اور وہاں بھی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، قبر میں بھی اور حشر میں بھی، غیب میں بھی اور حضور میں بھی۔ اس کی غیبت بھی حضور ہوتی ہے اس کا اضطراب بھی تسکین کہلاتا

ہے، اس کا انتظار بھی وصل ہوتا ہے، اور اس کا بُعد بھی قرب کہلاتا ہے۔ وجود کے کٹھن معرکے ہوں تو محبت ناصر بن کر خون میں دوڑنے لگتی ہے۔ قبر کا مرحلہ ہو تو وہ چودھویں کا چاند بن کر تسکین دینے آتی ہے۔ حشر کا میدان ہو تو وہ شافع بن کر گناہوں کی پردہ پوش بن جاتی ہے۔ نزع میں اس کی حیثیت مبشّر کی ہوتی ہے۔ عقل نہ مبشّر بن سکتی ہے نہ شافع۔ نہ تسکین نہ سہارا۔ تسکین اور سہارا، بشارت اور تسکین، یہ سب محبت کے مظاہر ہیں۔ محبت کے روپ ہیں۔ وہ ہر رنگ میں جلوہ گری کرتی ہے اور نوازتی ہے۔

مشاہدۂ جمال

ہر قوی ذات کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اسے اپنی رضا کے تابع نہیں بنایا جا سکتا۔ یہاں قوت کا مند دے۔ حیلے بہانے بیکار ثابت ہوں۔ وہاں اعتماد جیتنے کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ اس کے سامنے اپنی بے بسی کا اعلان کر دیا جائے۔ یہ اعترافِ شکست بسا اوقات انسان کے لیے غایت درجہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ یہی نہیں کہ اعترافِ شکست کے ذریعے انسان قوی ذات کی دستبرد سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ بلکہ کبھی یہ بھی ہوتا ہے

کہ حال کی شکستگی سے کہ جب انسان قوی ذات کے سامنے جاتا ہے۔ تو اس
کے جذبۂ رحم و کرم کو اس قدر تحریک ہو جاتی ہے کہ وہ نوازنے پر مجبور ہو
جاتی ہے۔ کبر و غرور کے ذریعے گدا کو سخی کی بارگاہ سے کچھ نہیں ملتا، بلکہ
سرزنش کا مستحق قرار پاتا ہے۔ حال کی شکستگی جب سائل بنتی ہے۔ تو محروم
نہیں رہتی۔ رحم آجانے سے جو نوازش ہوتی ہے۔ وہ اس نوازش سے کہیں
زیادہ ہوتی ہے جس کا محرک رحم و کرم کا جذبہ نہ ہو۔

ایک مزدور دن بھر مالک کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔ اسے
قاعدے اور قانون کے مطابق اجرت ملتی ہے۔ لیکن راہ چلتے کسی کریم ذات
کی ایسے شکستہ حال انسان پر نظر پڑ جائے۔ جس کی قوتِ گویائی بھی جواب
دے گئی ہو، اور وہ سوال کے قابل بھی نہ ہو تو سخی کا جذبۂ رحم و کرم ابھر
آتا ہے اور اسے اس قدر نواز دیا جاتا ہے۔ کہ برسوں کی محنت مزدوری
پر بھی وہ عطا بھاری ہوتی ہے حقیقی عطا وہی ہے، جو سخی کے دل سے
موج بن کر ابھرے، اور گدا کو اپنی لپیٹ میں لے لے، ہاتھ کی عطا ناپ
تول کی عطا کہلاتی ہے، یہ محدود ہوتی ہے، لیکن دل کی عطا کا اندازہ
نہیں لگایا جا سکتا۔ دل خود بے کراں ہے۔ اس کی عطا بھی بیکراں ہوتی
ہے اور دل کی عطا کو دل ہی کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ زبان
سوال کرتی ہے تو اس میں حسد اور محرومی، دونوں کے امکانات موجود ہوتے

ہیں دِل سائل بن کر صاحب دل کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے تو کبھی محروم نہیں رہتا۔ ظاہر کی عطا اہل ظاہر کے لیے ہوتی ہے اور دل کی عطا کے مستحق وہی لوگ قرار پاتے ہیں جن کے پہلو میں شکستہ دل ہو۔

دل کی شکستگی ظاہر کی شائستگی پہ فوقیت رکھتی ہے، اسی لیے زیادہ عطا کی مورد بنتی ہے۔

قرآن نے جنت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس میں وہ سب کچھ موجود ہو گا جس کی تمہارے نفوس آرزو کریں گے، اور جن چیزوں سے تمہاری آنکھیں لذت یاب ہوں گی۔ لیکن یہاں دل کا ذکر نہیں کیا گیا۔ نفس کے مطالبات پورے کرنے والی چیزوں اور آنکھوں کو فرحت بخشنے والی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد بات ختم کر دی گئی ہے۔ حالانکہ مملکت وجود میں دل کی بڑی اہمیت ہے، تو کیا ربانی کلام کا یہ مفہوم ہے، کہ اُخروی زندگی میں صرف نفوس اور آنکھیں ہی کامیاب ہوں گی؟ اور دل کو عطا و بخشش کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا؟ نہیں یہ بات نہیں، ربانی کلام کا مفہوم یہ ہے کہ نفوس اور آنکھوں کو ان کی پسندیدہ چیزیں عطا کر دی جائیں گی اور دل کو مشاہدۂ جمال نصیب ہو گا جس کی جو طلب ہو گی اسے مل کر رہے گی۔ نفس راحت چاہتا ہے، اسے وہ ملے گی آنکھیں نظر فریب جلووں کی طالب ہیں اور وہ یکتا نظارے انہیں دے دی جائیں گی۔

دل کا مطالبہ کچھ اور ہے، وہ ذات کا طالب ہے۔ وصالِ محبوب کے بغیر اسے چین نہیں آسکتا، اس کی شوریدگی ختم نہیں ہو سکتی۔ اور اس میں ٹھہراؤ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اسے جمال کی دولت سے نوازا جائے گا۔

بات چوں کہ دل کی تھی، اس لیے راز بنی رہی۔ نفس اور آنکھوں کی طرح اس کی تشہیر نہیں کی گئی۔ گویا یہی کہا گیا ہے کہ تم نے ہماری لقا کے بھید کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ہم بھی اسے ظاہر نہیں کریں گے پردے ہی پردے میں ملاقات ہو گی۔ تاکہ غیر نہ دیکھے، نہ سن سکے۔

محبّت کے جلوے

دو بچھڑے ہوؤں کی ملاقات عجیب و غریب کیفیات کی حامل ہوتی ہے بشرطیکہ دونوں میں روح کا رشتہ قائم ہو۔ روحانی رشتے کی استواری کے بعد فراق بھی مزا دیتا ہے اور وصال بھی رُوح کو گوناگوں لذتوں اور سرشاریوں سے آشنا کر دیتا ہے۔ بیگانے کو نہ ہی فراق کرب انگیز ہوتا ہے اور نہ ہی وصال کیفیتوں سے بہرہ ور کرتا ہے۔

مدتوں کے دو بچھڑے ملتے ہیں تو احساسِ جدائی آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپکنے لگتا ہے۔ آنسوؤں کا ہر قطرہ جدائی کی کرب انگیز ساعتوں کا

غماز بن جاتا ہے۔ بسا اوقات زبان خاموش ہوتی ہے اور آنسو کیفیتوں کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ دل کی دھڑکنیں ماضی کے ان سانحات کو دہرانے لگتی ہیں جن پر زبان و بیان کی تمام وسعتیں تنگ ہوتی ہیں۔ انہیں الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس نوع کی کیفیتیں درد آشنا اور سکون ناشناس دلوں میں پرورش پاتی ہیں، جب طوفان بن کر اٹھتی ہیں تو ان کا تحمل مشکل ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ سامنے والا دل بھی سکون ناآشنا ہو، درد کی لذت سے واقف ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا تعلق اور ربط دو ایسے دلوں میں استوار ہو سکتا ہے جن میں ازلی مناسبت ہو، دونوں کے مابین سرمدی رشتہ محبت قائم ہو، ایسے دل بچھڑتے ہیں تو بلکتے ہیں، ملتے ہیں تو تڑپتے ہیں، یہ تڑپ اور یہ سوز آگینی محبت بھرے دلوں کی ازلی میراث ہے جو ان سے کوئی نہیں چھین سکتا، نہ ہجر نہ ہی وصال نہ ہی حجاب اور نہ ہی بے حجابی، نہ ہی تغافل اور نہ ہی کرم، نہ ہی التفات اور نہ ہی بے التفاتی، التفات اور بے التفاتی، ستم اور کرم، جفا اور وفا، یہ تو سب محبت کے مظاہر ہیں۔ ستم بھی محبت کی ایک صورت کا نام ہے اور کرم بھی ایک ادا ہی تو ہے، اداؤں کو صرف لطف و کرم، الطاف و عنایت، نوازشات و اکرامات ہی میں محصور نہیں کیا جا سکتا، سمندر کی ہر موج حسین ہوتی ہے صبح کا ہر جلوہ دلنواز کہلاتا

ہے۔ چمن کی ہر کلی میں علیٰحدہ بُو باس ہے۔ یک کا افسردہ۔ ایک کا نکھر
خوئے محبت نہیں، یہ تو نری بوالہوسی ہے۔ محبت جب حدِ کمال کو پہنچ
جاتی ہے تو جفا و وفا، قہر و غضب، لطف و کرم کی حدود سے ماورا ہو
جاتی ہے۔ دریا اسی وقت تک کے لیے کناروں کا پابند ہوتا ہے
جب تک اس میں طوفان نہیں اٹھتے۔ طوفان اٹھتے ہیں تو کناروں
کی حدود قائم نہیں رہتیں۔ بے کنار کی فطرت ہے کہ وہ بے کنار کیے
چھوڑتا ہے کنارے سے ہوں تو مجبور دکھاتا ہے۔ بے پایاں ہو جائے
تو کناروں کا نام و نشان تک نہیں رہتا۔ محبت حُسنِ دلِ یزداں سے
نکلی ہوئی ایک تجلی کا نام ہے۔ یہ تجلی جب انسان کے قلب پر پڑتی
ہے تو اسے اپنی فطرت میں ڈھال لیتی ہے۔ نور ظلمت سے ہم آغوش
ہونے کے بعد اسے اپنی طلعتیں عطا کرتا ہے۔ اپنی تابانیاں بخشتا
ہے۔ طور صرف اسی وقت تک کے لیے طور تھا جب تک اس پہ تیغِ
جمال نہ گری تھی۔ برق نے گر کر اپنے مزاج میں ڈھال لیا۔ خاکستر بنا دیا،
تو وہ اربابِ بصیرت کی آنکھوں کا سرمہ بننے لگا۔ کلیمؑ کی ایک بیہوشی
پر کتنے ہوش صدقے ہونے لگے۔ ایک ہی تجلی نے کتنے دلوں
کو تڑپ عطا کر دی۔ کتنے دلوں کو سوز کی کیفیتوں سے آشنا کر دیا!
یہ آشنائی کیا تھی؟ برقِ تجلی کا فیضانِ جمال، حسن کی ضرب کا پرتو تھا

ہے کہ دل کی کیفیتوں کا اثر اور نتیجہ دائمی اثر صرف محبت چھوڑ سکتی ہے برقِ محبت کسی وادی اور صحرا میں کوند کر ختم بھی ہو جائے تو اس کے آثار و نقوش کو زمانے کی گردشیں اور لیل و نہار کے تغیرات نہیں مٹا سکتے۔ فانی کا اثر فانی ہوتا ہے، اور باقی جو اثر چھوڑتا ہے، اسے ثبات و دوام حاصل ہو جاتا ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم

مصوّر اندھے کو تصویر نہیں دکھاتا۔ تصویر وہیں دکھائی جاتی ہے جہاں یقین ہو کہ بصارت موجود ہے اور ذوقِ سلیم کی بھی کمی نہیں، دیکھنے والا فنی لطافتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اندھا سامنے ہو تو فن دکھانا مشکل ہوتا ہے۔ صاحبِ نظر مل جائے تو دکھائے بغیر چین نہیں پڑتا، یہی وجہ ہے کہ قرآن کے اسرار اہلِ دل پر کھلتے ہیں معانی و مطالب کا حسن انہی کو نظر آتا ہے۔

فن کار کا فن جب کمال کو پہنچ جاتا ہے، تو دل سے قیمت وصول کرنے کی طلب مٹ جاتی ہے۔ اس وقت وہ داد چاہتا ہے۔ داد مل جائے تو سمجھتا ہے کہ قیمت وصول ہو گئی۔ داد نہ ملے تو قیمت پانے

ہے جو کبھی ذوق کی سیرابی نہیں ہوتی ذوق سیرابی صرف داد کر سکتی ہے اور اسی سے تسکین ملتی ہے، صحیح داد دینے والا مل جائے تو مصور یہ کہہ کر تصویر پیش کر دیتا ہے کہ آپ کو پسند ہے تو آپ کی نذر ہے۔ بسا اوقات جہاں لعل و جواہر کام نہیں دیتے داد کام دے جاتی ہے۔ مصور کے فن کی قیمت ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو تو داد کا فن سیکھنا چاہیے۔ داد دینے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو شاہد کی جھولی میں آ کر رہتا ہے۔

یہ جو خدا تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک پر کثرت و تواتر سے درود شریف پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے اور درود شریف کے بے شمار فضائل بیان فرمائے ہیں، تو یہ کیوں؟ درود شریف دراصل نقاشِ ازل کے اس فن کی داد ہے، جو جمالِ محمدی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ (ﷺ) یہ فطرت ظہور پذیر ہو کر سامنے آگیا تو حکم ہوا کہ اس پر صلوٰۃ و سلام بھیجو، یہی ہمارے فن کی داد ہے۔ داد کی بہت سی قسمیں ہیں۔ بعض لوگ تصویر دیکھ کر ششدر رہ جاتے ہیں۔ ان کے سینے کا سوز و درد آنسو بن کر آنکھوں سے بہنے لگتا ہے۔ زبان مصور کی عظمتوں کا اعتراف کرنے لگتی ہے۔ یہ اعتراف ہی دراصل داد کی جان ہوتا ہے جو مصور کے احساسات کو مجبور کر دیتا ہے۔ ایسا داد دینے والا بھی مصور کی نگاہ میں محبوب بن جاتا ہے۔ وہ اس کے فن کو نہیں دیکھتا بلکہ

پر نظر نہیں پڑتی۔ یہی سمجھتا ہے کہ داد دینے والا مل گیا ہے تو تصویر کا حسن و جمال اس کا حق ہے۔ اب سے داد دینے والے کو کیسے محروم رکھوں۔ ہر عظیم فن کار کی فطرت میں سخا ہوتی ہے، اور اس کے جذبات کو داد ہی کے ذریعے متحرک کیا جا سکتا ہے۔ داد دی جائے تو جذبات میں تلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔ داد نہ دی جائے تو دل بجھ جاتا ہے کہ کس اناڑی کے سامنے شاہکار پیش کر دیا۔ دستِ قدرت کے بے مثل و بے مثال شاہکار سے اغماض ہی نے ابوجہل کو لعنتوں کا مستحق بنا دیا تھا۔ اور ابوبکر صدیقؓ کی صحیح داد ہی تھی جس نے انہیں صدیقؓ کے مرتبے پر فائز کر دیا۔

داد سے مرتبہ ہی نہیں ملتا، تصویر کا جمال بھی ملتا ہے، معرفت بھی حاصل ہوتی ہے اور سینہ لذت و کیفیات سے بھر جاتا ہے۔ شاہکار سے منہ موڑنے والوں کو نہ قرب ملتا ہے، نہ لذات و کیفیات۔ لذات و کیفیات تو صرف تصویر دیکھ کر جان دینے والوں کا حصہ ہوتی ہیں۔

عظمت کے گیت

چمن کا حسن مالی کی تخلیقی صلاحیتوں کا نمونہ و آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر پھول کی دلکشی میں اسے، اپنا ہی فنی حسن جلوہ گر نظر آتا ہے اس لیے پھولوں کی لطافتوں اور نزاکتوں سے اس کا غیر معمولی شغف در اصل اپنے ہی حسن سے غیر معمولی شغف کا نتیجہ ہوتا ہے پھول آئینہ ہوتے ہیں اس کے اپنے حسن و جمال کا، وہ مظہر بن کر سامنے آتے ہیں تو اس کے نزدیک عزیز بن جاتے ہیں، اس کا دل بھانے لگتے ہیں اور ان کا حسن اس کی مسرتوں میں اضافے کا موجب بن جاتا ہے۔ وہ انہیں ہر زاویے سے دیکھتا ہے۔ ان کی اداؤں اور دلفریبیوں کو اپنے فنی کمال کا مظہر جان کر ان سے پیار کرتا ہے۔

پھول خواہ کسی رنگ کے ہوں مالی کی عظمتوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں، ایک ایک سے اسے قلبی لگاؤ ہوتا ہے، ایک ایک کو وہ چاہتا ہے۔ اور ایک ایک کو عزیز جانتا ہے۔ ایک کا انکار بھی مالی کی عظمتوں کے انکار کے مترادف ہوگا۔ اس لیے کہ انہیں اس نے باغ کے حسن میں ضمنے کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ ایک ایک کی شگفتگی اس کے دل کی

شگفتگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ حسن ایک ہی ہوتا ہے صرف رنگوں کا فرق ہوتا ہے جو مختلف مظاہر میں ظاہر ہوکر دیدہ و دل کو تسکین بخشتا ہے۔ ایک پھول مالی کی پوری عظمتوں کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ عظمتوں کے ظہور کے لیے حسن کا مختلف مظاہر میں ظاہر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح مالی کی عظمتیں آشکار ہوتی ہیں، اس کی فنی صلاحیتوں کو داد ملتی ہے۔ داد حاصل کرنے کے لیے اور اپنی عظمتوں کا لوہا منوانے کے لیے مالی کی عظمتوں کا حسن کثرت میں پھیل جاتا ہے کثرت داد خواہ بنتی ہے تو وحدت کو تسکین ملتی ہے۔ وحدت کو کثرت سے داد حاصل کرنے کے لیے بھی کثرت میں پھیلنا پڑتا ہے۔ کثرت میں ظہور پذیر ہونا پڑتا ہے۔ کثرت کو حیران و ششدر کرنا پڑتا ہے تب کہیں جاکر وحدت کا دل سکون پذیر ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام وحدت کے باغ کے وہ مختلف النوع پھول ہیں جن کا حسن و جمال مختلف رنگوں اور صورتوں میں ظاہر ہوکر نوع انسانی کے سامنے آیا اور ان سے داد وصول کی۔

پھولوں کی داد مالی کی فنی صلاحیتوں کی داد کہلاتی ہے۔ وہ ہر نبی کا کمال اپنے خالق و مالک، پروردگار، آفرینندہ حسن و جمال کا کمال ہے، ان کی داد ان کے خالق و مالک کی داد ہے اور ان کی داد

ہے وہ ان کی تکذیب ان کے خالق و مالک کی تکذیب کہلائے گی۔

مالی کبھی اپنے تخلیقی حسن کو کثرت میں دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور کبھی چمن میں پھیلے ہوئے حسن کو وحدت کے لباس میں جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے۔ تو اپنی آرزو کی تکمیل کے لیے باغ کے سارے پھولوں کو توڑ کر یک جا گلدستہ کی صورت میں جمع کر دیتا ہے۔ مختلف رنگوں اور صورتوں میں چھپے ہوئے پھول جب گلدستے کی صورت میں ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو ان کا حسن اور بھی دل آویز اور جاذبِ نظر بن کر روح پہ اثر انداز ہونے لگتا ہے۔ پھول گلدستے میں آ جاتے ہیں تو اور بھی حسین معلوم ہونے لگتے ہیں۔

خالقِ حسن و جمال نے اپنے تخلیقی حسن کو مختلف صورتوں میں دیکھنا چاہا تو وقتاً فوقتاً مختلف انبیاء کو بھیج دیئے۔ کثرت کو وحدت کا رنگ دینا چاہا تو تمام انبیاء کے حسن و جمال کو ذاتِ محمدی میں جمع کر دیا۔ ایک نبی کی حیثیت ایک ایک پھول کی تھی اور ذاتِ محمدی کی حیثیت گلدستے کی ہے۔ پھول جب جدا جدا ہوتے ہیں تو ایک ہی رنگ و بو کی شان کے مالک کہلاتے ہیں، گلدستے میں آنے کے بعد ان کی شان کچھ اور ہو جاتی ہے۔ وہ دور ہی نہیں رہتے قریب آ جاتے ہیں۔ کیونکہ گلدستہ ترتیب ہوتا ہے اور ان کے حسن و جمال کی شان بھی نرالی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ایک نبی کا انکار تمام انبیاء کے انکار

کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ ایک پھول کا انکار گلدستے کے انکار کے مترادف ہوتا ہے۔ گلدستہ چونکہ مختلف پھولوں سے بنتا ہے اس لیے ہر پھول کی عظمت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ مختلف پھولوں کی عظمت ہی سے گلدستے کی عظمت بنتی ہے۔ گلدستہ تمام پھولوں کی عظمتوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوتا ہے ان کی بہار دکھاتا ہے ان کی عظمتوں کو آشکار کرتا ہے اور ان کی عظمتیں اس کی اپنی عظمتیں کہلاتی ہیں۔ اس لیے حضور علیہ السلام نے ہر نبی کی عظمت کے تحفظ و بقا کے لیے پوری پوری کوشش کی ہے۔ اور ہر نبی نے حضور کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔

ذات و صفات

قدیم ایام سے عرب میں یہ دستور چلا آرہا تھا کہ شاعر اپنا تازہ کلام خانہ کعبہ کی دیواروں سے لٹکا دیتے تھے۔ یہی ان کے تعارف کا ذریعہ بنتا تھا اور اسی کے ذریعہ ان کی فنی عظمتیں آشکار ہوتی تھیں۔ تا آنکہ ایک دن ان کی آنکھوں نے ایک ایسے کلام کو دیکھا جو ان کے دلوں میں اتر گیا۔ جو اپنے اسلوب بیان، تاثیر اور معانی و مطالب کے اعتبار سے اس کلام سے یکسر مختلف تھا جسے عرب شعرا اپنے لیے

سرمایۂ نازش وافتخار جانتے تھے۔

چند ربانی آیات کو ایک خوش ذوق نے وہیں لا کر لٹکا دیا جہاں شعرائے عرب کا کلام آویزاں تھا۔ ابوجہل کی نظر پڑی تو وہ چیخ اٹھا کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے۔

ابوجہل ہی کا یہ احساس نہ تھا ہر صاحب طرز اور خود کو وحید العصر جانے والے شاعر کا یہی احساس تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ جان کر وہ پریشان ہو گئے۔ اور ان کا سارا کیف و سرور ختم ہو گیا کہ یہ وہی کلام ہے جو عبداللہ کے بیٹے اور عبدالمطلب کے پوتے پر نازل ہوا ہے۔

کیدگی بعد میں پیدا ہوئی۔ پہلا تاثر یہ نہ تھا۔ پہلے تو وہ اس کی غایت درجہ مدح وستائش کر رہے تھے۔ غرض کسی ذات کی معرفت کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک ذات کی لگن اور ایک صفات کی معرفت۔ صفات کی معرفت بھی ذات کی معرفت عطا کرتی ہے اور انسان کسی ذات کی صفات سے آگاہ ہونے کے بعد اس کا گرویدہ بن جاتا ہے۔

لیکن ذات سے غیر معمولی لگاؤ کے باعث جو رشتہ قائم ہوتا ہے وہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ اور صفات کے ذریعے قائم ہونے والے رشتے میں یہ پختگی اور پائیداری نہیں ہوتی۔ کیونکہ صفات بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن ذات نہیں بدلتی۔

صحابہؓ کو حضورؐ کی ذات سے محبت تھی۔ اور یہی محبت انہیں عرفانِ رسولؐ عطا کر رہی تھی، قرآن تو تدریجاً نازل ہؤا ہے اور اس کی تکمیل وصالِ نبوّت کے قریب ہوئی ہے صحابہؓ اس وقت بھی عشق کے اعلےٰ ترین مقام پر فائز تھے جب قرآن کی چند آیات نازل ہوئی تھیں، عشق کی تکمیل صحابہؓ کی اس محبت سے کی، جو انہیں حضورؐ کی ذات سے تھی۔ صدیقؓ چہرہ دیکھ کر فدا ہو گئے۔ فدائیت کے لیے انہیں کسی دلیل کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ وہ ذات پر فدا تھے۔

ذات کے شیدائی اور صفات کے شیدائی میں یہ فرق ہوتا ہے کہ صفات کے شیدائی کی ساری سرگرمی اسی وقت تک کے لیے ہوتی ہے جب تک محبوب کی ذات میں وہ صفت موجود رہے جو کشش کا موجب ہو وہ صفت زائل ہو جائے یا اس میں ذرا سا تغیر آ جائے، تو عشق کی ساری سرگرمیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ذات کے فدائی کا ولولہ کبھی سرد نہیں پڑتا۔ حالات خواہ کیسے بھی ہوں وہ کرم کا مورد بنے یا ستم کا، اس پر لطف و عنایات کی بارش ہو یا تغافل برتا جائے، وہ تو تغافل کو بھی کرم سمجھ کر شاد ہونے لگتا ہے۔ جس کی وابستگی کا باعث صرف وہ ادائیں ہوں

جو اسے پسند ہوں وہ ان کے خلاف دیکھتا ہے۔ تو اسے دھچکا لگتا ہے۔ اور وہ محبت کی ساری بساط سمیٹنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ذات کا عشق ایسی تمام خامیوں سے پاک ہوتا ہے۔ ذات مقصود حیات نہیں بنتی تو صفات کی گرویدگی کو ثبات و دوام حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ عیش و آرام میں خدا کی رحیمی اور کریمی کے گن گانے والے بسا اوقات مصائب میں ملحد ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کے پیش نظر ذات نہیں، صفات ہوتی ہیں صفات میں تغیر دیکھتے ہیں تو بدل جاتے ہیں۔

نعمت اور منعم

اہل دنیا کے نزدیک غنا کا یہ مفہوم ہے کہ انسان کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہو اس کی حیات عیش و نشاط سے عبارت ہو۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ یہ مال کن ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے اس کے حصول کے ذرائع جائز تھے یا یہ ضمیر فروشی اور اصول شکنی کا نتیجہ ہے لیکن اہل آخرت کے نزدیک غنا کا یہ مفہوم نہیں۔ دنیا کا تمام تر ساز و سامان موجود ہونے کے باوجود اگر دل دولت ایمان سے خالی ہو تو وہ ایسے انسان کو مفلس جانتے ہیں۔

غنا کا تعلق مال و دولت کی فراوانی سے نہیں یہ خالصتاً ذوقی و وجدانی چیز ہے۔ روئے زمین کے خزانے موجود ہونیکے باوجود اگر انسان اپنے منعمِ حقیقی کی رضا حاصل نہ کرسکے تو وہ غنی نہیں کہلا سکتا۔ غنا کا تعلق منعمِ حقیقی کے لطف و کرم سے ہے۔ کچھ نہ ہونے کے باوصف اگر منعم کی رضا حاصل ہو تو انسان غنی ہوتا ہے اور اگر منعمِ حقیقی کے کرم سے محروم ہو تو دولت کی فراوانی بھی اسے غنی نہیں بنا سکتی۔ بعض لوگ کچھ نہ ہونے کے باوجود غنی ہوتے ہیں۔ اور بعض کو مال و دولت کی فراوانی بھی احتیاج سے بے نیاز نہیں کرسکتی۔ کیونکہ ان کے پاس منعمِ حقیقی کی رضا کی دولت نہیں ہوتی۔ قارون اپنے تمام تر خزانوں کے باوجود مفلس تھا اور بلال حبشیؓ اور ابوذر غفاریؓ کچھ نہ ہونے کے باوجود غنی تھے

بندے پر جب خدا تعالیٰ کا خصوصی کرم ہوتا ہے تو اس کے دل میں رضا کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ وہ مال و دولت کو چنداں قابل التفات نہیں سمجھتا اور اس کے ہونے یا نہ ہونے سے اس کی طلب میں کوئی کمی پیدا نہیں ہو سکتی رضا کا خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ انسان کو دوسری تمام چیزوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ رضا کا طالب صرف رضا کا طالب ہوتا ہے۔ وہ اس کے دل میں کوئی دوسری طلب راہ نہیں پا سکتی۔ دوسری طلب اگر بے چین کرنے لگے، رضا کی منزل سے جس کو

نگاہوں سے اوجھل کر دے خواہ وہ ایک لمحہ کے لیے ہی کیوں نہ ہو تو یہ عجب
خام ہو گی۔ طلب جب حدیث بن جاتی ہے تو اس کا محور و مرکز صرف رضا
قرار پاتی ہے۔ مال و دولت کی کمی پر نظر نہیں ہوتی۔ بلال حبشیؓ اور ابوذر
غفاریؓ کی صف میں وہ تہی دامن بھی ہوتی ہے، دامن تار تار بھی ہوتا
ہے۔ اسے پیوند لگے ہوتے ہیں۔ ملبوس ہوتی ہے۔ تو پھر بھی اس کی سرمستیوں کو
ہفت اقلیم کے سلطان مال و دولت سے حاصل کیا ہوا نشہ بھی نہیں
پہنچ سکتا۔ تہی دامنی میں مست و سرشار صرف منعم کی رضا کا طالب ہی
ہو سکتا ہے، جو منعم کو نعمت کی کمی بیشی سے نہیں پہچانتا ہے۔ وہ اسی کو تعلق
کا معیار بنا کر رشتہ استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ قائدِ منزل نہیں ہو
سکتا۔ فوز و فلاح صرف طالبِ رضا کا حصہ ہے۔ اور یہ انہی کو حاصل ہوتی
ہے جو نعمت کو معیارِ تعلق بنانے کی بجائے منعم کی رضا کو معیارِ تعلق جانتے
ہیں۔ منعم کی رضا کے طالب کے تعلق کو ثبات و دوام حاصل ہوتا ہے
اور نعمت کے بندے کبھی ایک حال پر قائم نہیں رہ سکتے۔ نعمت کے بڑھنے
کے ساتھ ساتھ ان کے خلوص کے دعوے بھی بڑھنے لگتے ہیں۔ نعمت کم ہو
جائے تو خلوص کے دعووں کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور اگر دنیاوی
نعمت کا تسمہ اٹھ جائے تو ان کے تعلق کے سارے قصر و ایوان منہدم
ہو جاتے ہیں۔ منعم کی رضا کے بندوں کے ساتھ یہ صورت پیش نہیں

آسکتی۔ خدا کے بندے ہر حال میں رضا کے بندے رہتے ہیں۔ بچھوؤں سے دامن بھر جائے ان کی نسبت میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا اور دامن کانٹوں میں الجھ کر پھٹ جائے تب بھی ان کی نسبت پر کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ نعمت کے بندے کی نظر سے نعمت کی رضا کا حسن و جمال پوشیدہ ہوتا ہے اور رضا کے بندے کبھی نعمت کو مقصد حیات نہیں بناتے۔ دونوں کی منزلیں جدا جدا ہیں اور دونوں کا انداز نظر بھی مختلف ہوتا ہے۔ ایک کو دوسرے سے کوئی واسطہ نہیں اور ایک دوسرے کی واردات و کیفیات کو نہیں سمجھ سکتا۔

مشاہدے کی لذّتیں

یہ کائنات جو مختلف شیون و مظاہر کی صورت میں نظر آتی ہے قدرت کے ایک سربستہ راز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں ہر ایک چیز کی ماہیت الگ ہے اور مزاج جداگانہ۔ ایک کو دوسرے سے کوئی مناسبت نہیں۔ ایک دوسرے کے ضد ہیں۔ کائنات میں اس قدر تضاد اور اختلاف پایا جاتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے نہ مزاجی ملاپ ہے نہ ترکیبات میں آپس میں کوئی مناسبت نظر آتی ہے۔ حد یہ ہے کہ غذا اور اعمال نے سیدھے ...

بھی اندازِ فکر جداگانہ ہوتا ہے۔ ایک کو ایک چیز مرغوب ہوتی ہے اور
دوسرے کے لیے وہی قابلِ نفرت قرار پاتی ہے۔ ایک کی جاذبیت
دکشش کو ایک انسان منتہائے مقصود قرار دے کر اس کے حصول کی تگ و
دو میں تمام راحتیں قربان کر دیتا ہے اور دوسرا اسے قطعی طور پر [illegible]
تنفر سے محو کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ جس چیز سے فطری طور پر نفرت
ہو اسے دلائل و براہین کے ذریعے مقبول و محبوب نہیں بنایا جا سکتا اور
جو چیز دل کو بھاتی ہو وہ دلائل کے ذریعے معیوب نہیں بن سکتی۔ یہی نفسی تاثر
ہی تو ہے جو کسی چیز کو محبوب بناتی ہے۔ چاندنی رات میں چکور کا رقص
کسی دلیل کا متحمل نہیں ہوتا۔ اپنی قلبی کیفیت کو وہ چاندنی کے آئینے میں دیکھتا
ہے۔ تو چاندنی اور زیادہ حسین و دلفریب اور کیفیت افزا نظر آنے لگتی
ہے اور وہ رقص کرنے لگتا ہے۔ رقص اور وجد لانے والی دراصل چکور کی اپنی ہی
کیفیت ہوتی ہے۔ چاندنی کی حیثیت تو محض آئینے کی ہوتی ہے۔
[illegible] کی نفرت [illegible] آئینے [illegible]
[illegible] تو [illegible] ایک نئی [illegible]
[illegible] سرشار ہوتا ہے [illegible] آئینہ دیکھ کر [illegible]
ہو سکتی جو حسن بے پرواز کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آئینے [illegible]
[illegible] کا غماز ہوتا ہے۔

دلیل جنتی کو آئینے کا گرویدہ نہیں بنا سکتی۔ صورت دل فریب پائی ہو تو آئینے کے تقاضا مد پڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اگر آئینہ سامنے آجائے اور اس میں چہرہ دیکھنے لگا جمال بینی کی لذت خود بخود فزوں ہونے لگتی ہے پہروں آئینہ دیکھنے سے بار بار بھی ذوق کی سیرابی نہیں ہوتی۔ اس کی جنتی خواہش ہوتی ہے کہ یہ تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ جنتی کے دل میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

عبادت و قبولیت بھی قدرت کے مصفّا اور مجلّا آئینے ہیں۔ سعید فطرت انسان ان میں اپنی فطرت کا حسن دیکھتا ہے تو اس کا ذوق سیراب نہیں ہوتا۔ پہروں عبادت میں رہ کر ذوق کی سیرابی چاہتا ہے۔ منافق کے لیے عبادت میں چند لمحے گزارنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی فطرت کا کھوٹ اس کے سامنے آ جاتا ہے جو اسے عبادت کے آئینے کے سامنے ٹکنے نہیں دیتا۔

کافر اور منافق کی زندگی کا تمام تر انحصار دلیل و برہان پر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی زندگی سکون سے محروم رہتی ہے۔ عقل کا پجاری دلیل چاہتا ہے اور دلیل تشنگی پیدا کرتی ہے۔ سنت دلیل نہیں چاہتی، وہ اشتغال [illegible] ب کا ذکر سن کر ہی وہ مشتعل ہو سکتی ہے۔ دین [illegible] پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا مقصود چونکہ [illegible]

محبوب کی ذات ہوتی ہے اس لیے اس میں وحدت ہوتی ہے اور عقل کا مقصود چونکہ واحد نہیں ہوتا اس لیے قدم قدم پہ انتشار کا شکار ہوتی ہے۔

عقل استدلال کی خواہاں نہیں اور محبت کو دلیل کی ضرورت پیش نہیں آتی ایک کے مقدر میں انتشار کی بے کیفیاں ہیں اور ایک کے نصیب میں مشاہدے کی لذتیں مقصود کے جدا ہونے سے نتائج بھی جداگانہ مرتب ہوتے ہیں۔

محبت کے معجزات

حیات انسانی کا مقصود ظاہری آرائش و زیبائش ہی نہیں باطن کی تطہیر انسان کا اصلی جوہر ہے اگر دل پاک ہو تو ظاہری آرائش کے بغیر بھی انسان زندگی کا وہ مقصود حاصل کر سکتا ہے جس کے لیے اس کی تخلیق کی گئی ہے۔ صرف ظاہری آرائش ہی مقصود کو پانے کا ذریعہ نہیں بن سکتی طبیب حاذق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مفہوم کو کتنے بلیغ انداز میں بیان فرمایا ہے۔ حضور فرماتے ہیں کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جسے دل کہا جاتا ہے۔ گوشت کا یہ لوتھڑا صحیح ہو جائے تو انسان کا

جسم تندرست ہو جاتا ہے۔ اس دو نظرئیے کی صحت کے بغیر جسم کی صحت ممکن نہیں۔

حضورؐ کی بعثت کا مقصود صرف پند و موعظت ہی نہ تھا۔ حضورؐ تزکیۂ نفس بھی فرماتے تھے۔ نگاہ نبوّت معصیت سے آلودہ دلوں کو پاک صاف کر دیتی تھی۔ آفتاب کے سامنے آجانے کے بعد ظلمتوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ آفتاب کی تجلیاں ظلمتوں کو نور سے بدل دیتی ہیں۔ جہاں ظلمتوں کا تسلط ہو نور کی تابانیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ آفتاب نبوت کے سامنے آجانے سے بھی دل کی کدورتیں دُھل جاتی تھیں۔ کفر و شرک کی تیرگیاں مٹ جاتی تھیں۔ یہ فیضان نبوت ہی تو تھا جو صدیقؓ، عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ، ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ اور صہیبؓ رومی کو بارگاہِ نبوت میں کھینچ لایا۔ متحرک میں کھینچنے کی صلاحیت موجود ہو تو محرک کی کرشمہ زائیاں وبدنی ہوتی ہیں۔ پروانے کی طلب شمع کے وجود کا خود ہی احساس دلا دیتی ہے۔ سوز سے محروم پتنگوں کے لیے نہ شمع کی ضیا دیدنی ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا جمال انہیں کھینچ سکتا ہے۔ کھینچتی ہے تو وہ بھی محبت کی مستی اور کھینچتی ہے تو وہ بھی محبت کے سوا کوئی چیز نہیں ہوتی جب رہنما بن کر سامنے آتی ہے تو منزل رسیدہ بنائے بغیر نہیں چھوڑتی۔ طلب کے بغیر محبت کی راہ میں دو قدم چلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ ہوس ہمیشہ

آرام چاہتی ہے وہ سکون کی طالب ہے۔ اغراض پسندی ہوس کی فطرت میں
داخل ہے۔ محبت کے دل میں اپنے سے زیادہ محبوب کی طلب کا التزام
ہوتا ہے۔ وہ اغراض سے پاک ہوتی ہے۔ ہوس سے اس کا دامن آلودہ
نہیں ہوتا۔ آلودگیاں تو ہوس کا حصہ ہیں۔ ہوس کا مقدر ہیں وہ ان سے
نہیں نکل سکتی۔ محبت کی بارگاہ کے دروازے اس پہ کب کھل سکتے ہیں۔
کشادگی محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ محبت خود کشادہ ہے۔ وہ ناہموار
راستوں کو ہموار کر دیتی ہے۔ تلخیوں کو شیرینی میں بدل دیتی ہے۔ تنگیوں
میں بے کراں وسعتیں پیدا کر دیتی ہے۔ جہاں کسی چیز کی گنجائش نہیں ہوتی
وہاں محبت کے لیے گنجائش نکل آتی ہے۔ جن رفعتوں تک کوئی نہیں
پہنچ سکا وہاں محبت پہنچی ہے۔ اس نے ان حجابات کو اٹھایا ہے
جو ازل سے پڑے تھے۔ اس نے ان جلووں کو بے نقاب کیا ہے جو
ہمیشہ سے حجاب میں تھے۔ ہوس پہ نہ کبھی نا کشودہ دروازے کھلے
ہیں نہ ہی اسے باریابی حاصل ہوئی ہے۔ باریابِ ازل سے محبت ہے
نذرالمرامی اس کا حصہ ہے۔ جس راہ پہ ہوس کا کارواں نہیں گزر سکتا۔
محبت بے کھٹکے گزر جاتی ہے۔ جن مفاہیم کو ہوس نہیں سمجھ سکتی محبت
نے ہمیشہ ان کی وضاحت کی ہے۔ انہیں بیان کیا ہے اور ان کی لذتوں
سے قلوب میں سرشاری بھر دی ہے۔ دلوں کو مستیاں عطا کی ہیں۔ ذوق

وجدان کو مست کیا ہے۔ مستیاں اور سرشاریاں محبت کا فیضان ہوتی ہیں یہ کیفیتیں محبت عطا کرتی ہے۔ محبت خود مست ہے وہ مستی بانٹتی ہے۔ ہوس نہ خود مست ہے اور نہ مست کر سکتی ہے۔ اس کے پلے میں بے کیفی کے سوا کیا ہے یہ مستی اس نے نہ ازل میں چکھی تھی نہ ابد میں چکھے گی۔ جن روحوں نے ازل میں محبت کی مستی کا مزہ چکھا تھا وہ عالم آب و گِل میں آنے کے بعد بھی اس سے محروم نہیں۔ ہوس عطیہ دینے کے بعد چھین لیتی ہے یا وہ خود بخود چھن جاتا ہے۔ محبت عطا کرنے کے بعد نہ خود چھینتی ہے نہ اس کے عطیے کو کوئی چھین سکتا ہے۔ وہ خود باقی ہے اس کے عطیات بھی باقی رہتے ہیں۔ زوال نہ محبت کو ہے نہ اس کے عطیات کو۔ بقاء کی منزلوں کا مسافر ہی بقاء کی حقیقتوں سے آشنا کر سکتا ہے۔ فانی منزل کا مسافر خود فانی ہوتا ہے اور اس کے عطیات بھی فانی ہوتے ہیں۔ زمانے کی تغیر پذیر رفتار کے ساتھ وہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتے۔ انقلاب کی ایک ٹھوکر ان کی آب و تاب ختم کر دیتی ہے۔ محبت کے عطیے انقلابات کی زد میں آتے ہیں تو ان میں اور چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا حسن نکھرتا ہے۔ ان کی رعنائیوں میں اور دلآویزیاں پیدا ہوتی ہیں۔ محبت کی دلآویزی براہ راست روح پر اثر انداز ہوتی ہے۔ دل و دماغ پر شب خون مارتی ہے اور رگ رگ میں نشہ بن کر سما جاتی ہے۔ روح اور روح

کی ساری مخلوق میں اس کی جلوہ گاہ ہیں۔ جسمِ انسانی کا رشتہ ریشہ اس کی منزل ہے یہاں محبت ہی جلوہ گر ہو سکتی ہے اور اپنے معجزات دکھا سکتی ہے۔ ہوس کی یہاں رسائی ممکن نہیں۔

مے نہ گنجد در زمین و آسماں
در میانِ سینہ حیرانم کہ چوں جا کردہ ای

قلبِ سلیم

انسان کو قدرت نے سننے، دیکھنے، چکھنے اور چھونے کی قوتیں بخشی ہیں۔ ان میں سے ایک قوت بھی موجود نہ ہو، تو دوسری قوتوں کے ذریعے اس کی تلافی نہیں کی جا سکتی۔ آنکھ کا کام دیکھنا ہے، یہ اگر نور سے محروم ہو جائے تو سماعت کے ذریعے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ عقل کی جنس خواہ کتنی بھی وافر مقدار میں موجود کیوں نہ ہو، سماعت سے محروم ہونے کے بعد انسان عقل کے ذریعے سن نہیں سکتا۔ ہر حس کا الگ وظیفہ حیات ہے اور دوسرے حواس کو اس کی مملکت میں دخل اندازی کی اجازت نہیں۔

قدرت کا یہی قانون باطنی دنیا میں بھی کار فرما ہے۔ باطنی حواس اگر بیکار و معطل ہو جائیں، تو ظاہری حواس اس کمی کو پورا نہیں کر سکتے۔ روح و قلب

جو عطیۂ ربانی کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے ذمے بھی بہت کام ہیں۔ عقل اپنی تمام تر طرفہ کاریوں کے باوجود روح و قلب کا وظیفہ سرانجام نہیں دے سکتی اور نہ دوسرے حواس اس میں کام آسکتے ہیں۔ سر کے ذمے الگ خدمت ہے اور پاؤں کے ذمے الگ نہ پاؤں سر کا کام دے سکتے ہیں، اور نہ سر کے ذریعے ہاتھ کا کام لیا جا سکتا ہے، جو جس خدمت پر مامور ہے، وہی کام دے گا۔

ہدایت ربانی کا تعلق انسان کے ظاہری حواس سے نہیں، بلکہ دل سے ہے۔ عقل کی حیثیت تو محض ایک آلہ کی سی ہے، وہ جو پیام سنتی ہے، اسے خواہ وہ حق ہو یا باطل، دل کے کانوں تک پہنچا دیتی ہے۔ قبول کرنا یا رد کرنا دل کا کام ہوتا ہے۔ دربان کا کام تو یہی ہوتا ہے کہ وہ شاہ کی بارگاہ میں آنے والوں کی اطلاع دیدے۔ باریابی عطا کرنا یا رد کر دینا شاہ کا کام ہوتا ہے۔ دربان کو یہ قدرت حاصل نہیں۔ عقل بھی نہ رد کر سکتی ہے نہ قبول کر سکتی ہے۔ رد و قبول کا فیصلہ مملکتِ وجود میں فرمانروائی کرنے والے بادشاہ دل کے سپرد ہے۔ دل میں سلامتی موجود ہو تو وہ کسی رد و قدح کے بغیر ہدایت قبول کر لیتا ہے۔ سلامتی سے محروم دل کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی۔ ربانی ارشاد کے مطابق رضوان کی منزل اس انسان کو حاصل ہو گی جو اپنے مولا کی بارگاہ میں قلبِ سلیم لے کر حاضر ہو گا۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ جو

انسان عقل ۔۔۔۔ کی بوالعجبیوں اور حیرت زائیوں کا پشتارہ اٹھا کر پہنچے گا، وہ نوازا جائے گا۔ نوازش اور کرم کو صرف قلب سلیم لے کر حاضر ہونے والوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ ایک ذہین و فطین انسان جو نہایت درجہ عقل مند ہو لیکن اس کا دل گندہ ہو، دنیا کی کسی بارگاہ میں نہیں ٹک سکتا۔ ایسے ذہین کو نکال دیا جاتا ہے اور بھولا بھالا پاک دل انسان بسا اوقات مقرب بن جاتا ہے۔ قرب دل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے عقل کے ذریعے صحبت نصیب ہو بھی جائے تو اسے قرب نہیں کہا جا سکتا کیونکہ عقل پاس رہ کر بھی دل کا راز نہیں پا سکتی اور دل دور رہ کر بھی محبوب کے دل کے بھیدوں سے واقف ہوتا ہے۔ ادھر دل دھڑکتا ہے اور ادھر برسوں کی مسافت پر ہونے کے باوجود محبوب کے دل کی دھڑکنوں کو اپنے دل میں محسوس کیا جاتا ہے۔ عقل قریب رہ کر بھی دور رہتی ہے اور محبت بھرا دل دور رہ کر بھی حضوری کے مزے لوٹتا ہے

قرآن کا نزول عقل پر نہیں دل پر ہوا ہے۔ یہ پیار کا بھید ہے، پیار کی امانت ہے اس لیے دل کے سپرد کی گئی ہے۔ اب بھی یہ دولت اہل دل کو ملتی ہے۔ اہل عقل پر تو اس کے حقائق و معارف نہیں کھل سکتے۔ دل کی امانت عقل کے پاس کیسے پہنچ سکتی ہے؟

ازل میں بھی محبت کا امین دل تھا اور چونکہ یہ امانت اسی

کے پاس رہے گی۔ یہ ایسا خزانہ نہیں جسے عقل کے راہزن لوٹ سکیں۔ دوزر
اپنی جان دے دیتے ہیں لیکن راز نہیں دیتے۔ رازداری دانائی سرشت ہے
عقل کی نہیں۔ عقل کے آبگینے تو ایک ہی ٹھوکر سے پاش پاش ہو جاتے ہیں۔
اور وہ راز اگلنے لگتی ہے۔ دل کو چیر کر زیرت کی انی پر بھی رکھ دیا جائے تو
وہ صدیق رہتا ہے۔ امین رہتا ہے۔ عقل کا رشتہ قائم ہونے کے بعد ٹوٹ
جاتا ہے اور دل کا رشتہ قائم ہونے کے بعد کبھی نہیں ٹوٹتا۔ اسی لیے سب
سلیم کی بڑی اہمیت ہے۔

زندگی کی راہ

کافر کی زندگی کی تمام ترتگ و تاز دنیوی زندگی کے لیے ہوتی ہے لیکن اخروی
زندگی کا چونکہ کوئی واضح تصور اس کے سامنے نہیں ہوتا اس لیے اس کے
دل میں آخرت کے لیے کوئی امنگ پیدا نہیں ہوتی۔ اپنا سب کچھ وہ
دنیوی زندگی ہی کو سمجھتا ہے اور اسی کے لیے مرتے دم تک کوشش
میں مصروف رہتا ہے۔ مومن دنیا کو آخرت کی کھیتی جانتا ہے۔ اس
لیے دنیوی کاروبار میں مصروف بھی رہتا ہے تو اس کی نظر آخرت
کو سدھارنے پر مرکوز رہتی ہے۔ آخرت مومن کے نزدیک دنیا کا

ثمرہے یہاں اپنے فرائضِ حیات سرانجام دیتے وقت اس کا دل اس احساس سے لبریز رہتا ہے کہ مجھے ایک دن ان کا جواب دہ ہونا ہے۔ جو وظائفِ حیات میں یہاں سرانجام دوں گا؛ اس کا مآل اخروی زندگی میں میرے سامنے آکر رہے گا۔

کسان کو اپنی زندگی میں ایک ہی موسم سے نہیں گزرنا پڑتا۔ مختلف موسموں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ سردی اور گرمی کے کئی ادوار اس پر گذرتے ہیں۔ کبھی سردی کی بولناکی اس کے عزم کا امتحان لیتی ہے اور کبھی اسے گرمی کو برداشت کرنا پڑتی ہے۔ برق و باراں کے مختلف مناظر بھی دیکھنے پڑتے ہیں۔ اس کی زندگی میں کئی ایسے مواقع آتے ہیں جب دل و دماغ پر خوفناک کیفیتیں طاری ہو جاتی ہیں۔ اپنی محنت کا ثمر اسے رائگاں ہوتا ہوا نظر آنے لگتا ہے اور اس کے دل کی دھڑکنیں دعا بن کر قاضی الحاجات کو پکارنے لگتی ہیں۔ غرض کسان کی زندگی ایک پیہم کش مکش، جدوجہد اور امید و بیم کی زندگی ہوتی ہے۔ قدرت نے اسے جو ثبات آشنا دل بخشا ہوتا ہے وہ یاد و یدار میں بھی اسے ناامید نہیں ہونے دیتا اور طوفانوں میں گھر کر بھی اس کی جدوجہد کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس کی نظر خدا تعالیٰ کی بے پناہ رحمتوں پر مرکوز رہتی ہے۔ تب کہیں جا کر اسے اپنی محنت کا ثمر خرمن کی صورت میں نظر آتا ہے۔

حضور علیہ السلام نے دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا ہے۔ اس کھیتی میں کام کرنے والوں کو بھی مختلف حالات پیش آتے ہیں۔ جہاں جذبات سرد ہو کر رہ جاتے ہیں اور زندگی کے مطلع پر امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی، چاروں طرف کڑکتی بجلیاں خرمنِ حیات کو جلا کر خاکستر کر دینے کے لیے کوندتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ طوفان کی شورشوں میں نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی اور نگاہوں کے سامنے ایسا مہیب اندھیرا دکھائی دینے لگتا ہے جس میں دو قدم چلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں نظر اس قادر و قیوم پر رہتی ہے جو نیست کو ہست اور ہست کو نیست کر دینے کی قدرت رکھتا ہے، تو مصائب کے بادل چھٹ جاتے ہیں، تاریکیاں نور میں تبدیل ہو جاتی ہیں، اور ظلمتیں لو دینے لگتی ہیں۔ کسان حالات کی ناسازگاری کے باعث دل برداشتہ ہو کر بیٹھ جائے اور اپنی جدوجہد کا سلسلہ منقطع کر دے، تو رحمتِ باری اس کی معاون و مددگار نہیں ہو سکتی۔ رحمتِ باری اسی انسان کی معاون و مددگار رہتی ہے جو طوفان میں بھی اسے پکارتا ہے۔ حالات کی ناسازگاری میں بھی اس کی نظر خدا کے لطف و کرم پر رہتی ہے۔ جہاں تمام وسائل منقطع ہو جائیں وہاں وہ اسی ذات کو اپنا مشکل کشا سمجھ کر پکارنے لگتا ہے جو ہر حال میں مشکل کشائی کی قدرت رکھتی ہے۔

کافر کی نظر نہایت محدود ہوتی ہے۔ وہ وسائل کے پس پردہ کارفرما قوت کی اہمیت کا اندازہ لگانے سے قاصر رہتا ہے۔ وسائل موجود ہوں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ وسائل میں کوئی کمی آجائے تو اس کی امیدوں کے تمام چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ اس کی گھبراہٹ دیدنی ہوتی ہے۔ مومن کی یہ شان نہیں۔ وہ وسائل کی موجودگی میں بھی کارسازِ حقیقی کو پکارتا ہے۔ اور وسائل کے معدوم ہونے کے بعد بھی اس کی نظر خدا کی قدرت کاملہ پر ہوتی ہے۔ ایک کی نظر میں وسائل کارساز ہیں اور ایک کی نگاہ میں وسیلہ دیدہ نہ ہونے کے باعث بھی وہ خدا تعالیٰ ہی کو کارساز سمجھتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی نصرت و اعانت انہی لوگوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے جو اسے کارسازِ حقیقی سمجھتے ہیں۔ وسائل کی موجودگی میں وہ خدا تعالیٰ کی ذات سے بے نیاز نہیں ہوتے اور وسائل کے نہ ہونے کے باعث یہ خطرہ ان کے قریب نہیں پھٹک سکتا کہ اب خدا تعالیٰ کی نصرتوں کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ ہر حال میں اسی سے لو لگائے رہتے ہیں اور یہی لو ان کی زندگی کی راہوں میں بدرِ منیر بن کر چمکتی ہے۔ زندگی کی راہیں ان پر کشادہ کر دیتی ہے۔ اور منزلیں سمٹ کر ان کے قدموں میں آجاتی ہیں۔

قدرت کی تقسیم

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی من حیث القوم حق کا ساتھ دیا ہے، خدا تعالیٰ کی تائید ان کے شاملِ حال رہی ہے۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر ان کی کامیابیوں کے لیے نئی نئی راہیں کھلی ہیں۔ زمانہ ان کے مزاج کے مطابق ہو گیا۔ انہوں نے جو ارادہ کیا وہ پورا ہوا، جس دروازے پر دستک دی وہ کھلا، جس محاذ پہ قدم رکھا اسے سر کر کے چھوڑا۔ کوئی مشکل ان کے سامنے مشکل نہ رہی، دریا پہاڑ اور صحرا ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکے۔ ابتلا اور امتحان کا دور اسی وقت شروع ہوا جب انہوں نے اسلامی اصولوں کو نظر انداز کر دیا۔ وہ راہ اختیار کی جو ضلالت کی راہ تھی۔ ربانی ہدایات کو نظر انداز کرنے کے بعد نہ ہی ان کی کثرت انہیں عبرتناک ہزیمتوں سے بچا سکی نہ ہی جنگی ساز و سامان کی فراوانی ان کے اخلاقی انحطاط کا مداوا بن سکی۔

مسلمانوں کے عروج و اقبال کا دور اسی وقت [illegible] جب زندگی کی شاہراہوں میں ربانی ہدایت ان کے لیے مشعلِ [illegible]

رہی تھی۔ فوز و فلاح ان کے نزدیک ان راحتوں سے زیادہ عزیز تھی جو انہیں غلط راہ پر چل کر حاصل ہو سکتی تھیں۔ رنج و راحت خوشی اور غم کے باب میں ان کا تصور ہمارے تصورات سے یکسر مختلف تھا۔ ہم مسرتوں سے دامن بھر لینے کے آرزومند رہتے ہیں اور اس بات کا قطعاً خیال نہیں کرتے کہ یہ مسرتیں جن کے حصول کی آرزو ہمیں شب و روز بے چین رکھتی ہے انہیں حاصل کرنے کے لیے جائز ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔ ناجائز ذرائع سے جو مسرتیں حاصل ہوں گی، وہ ہماری حیات میں وہ تازگی پیدا نہ کر سکیں گی جو ایک مومن کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ حیات ہوتی ہے۔

> جسم کی مسرت روح کی مسرت کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ ایک انسان فاقہ کش ہونے اور راحت و آرام کے ساز و سامان سے محروم ہونے کے باوجود روحانی مسرتوں کا مالک ہو سکتا ہے اور ایک تاجِ خسروی سر پر رکھنے کے باوجود روحانی مسرت سے محروم رہ سکتا ہے۔

حقیقی مسرت روح کی مسرت ہے۔ اور یہ جنس زر و جواہر سے نہیں خریدی جا سکتی۔ روحانی مسرت جنسِ بازار ہوتی تو آج ہر کوئی خریدتا جتنے صاحبِ ثروت ہیں وہ مالی طور پر مستغنی ہوتے انہیں روحانی مسرتیں حاصل ہوتیں اور ان کی ظاہری حیات کی طرح ان کی روح بھی

خوشیوں کے گہوارے میں جھومتی ہوئی نظر آتی لیکن جو خدا اس کائنات پر بے لاگ قانون کے ساتھ فرمانروائی کر رہا ہے اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو وہی بخوبی سمجھتا ہے۔ انسانی حیات کے لیے جو چیزیں ناگزیر تھیں، وہ اس نے اپنے کنٹرول میں رکھی ہیں۔ جو چیز جتنی زیادہ ضروری ہے۔ اسی قدر انسان کی دسترس سے باہر ہے اس پر اس کا اپنا کنٹرول ہے کہ اس سے مفلس و تہی دامن انسان محروم نہ رہیں۔ ہوا جو حیات انسانی کے لیے ضروری تھی، وہ اس نے اپنے قبضے میں رکھی۔ پانی انسانی حیات کے لیے ضروری تھا، وہ بھی اسی کے قبضے میں ہے۔ مسرت بھی حیات کا ایک لازمی جزو تھی، یہ بھی اپنے قبضے میں رکھی۔ جب چاہا جسے چاہا مسرتیں عطا کر دیں۔ بعض ایسے امیر دیکھے گئے ہیں جو سب کچھ ہونے کے باوجود غذا سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ ان کے معدے دائمی طور پر خراب رہتے ہیں۔ اور انہیں بھوک نہیں لگتی۔ بعض لوگوں کو نیند نہیں آتی۔ یہ سب چیزیں قدرت کے انعامات و عطیات ہیں۔ مال و دولت ہی عطیہ نہیں صحت بھی عطیہ ہے۔ ذوق سلیم بھی عطیہ ہے اور قادر مطلق کی کرامت کا نشہ بھی اس کا خاص انعام ہے۔ تقسیم اس کی ہے، کسی کو کچھ دے اور کسی کو کچھ۔ بندگی کی شان تو یہی ہے کہ مبدأ فیاض سے جو کچھ ملا ہے اس کا شکریہ ادا کیا جائے جس گدا کی نظر اپنے کاسے کی خیرات پر رہتی ہے

اس میں شکر پیدا ہو جاتا ہے اور جو دوسروں کی چیزوں پر نظر رکھتا ہے وہ شکر کی توفیق سے محروم ہو جاتا ہے۔ بندگی کی شان یہ نہیں کہ انسان اپنے عطیات کو نظر انداز کر دے اور دوسروں کے عطیات پر للچائی ہوئی نظریں ڈالے۔ شکر نعمت کے جذبات کو متحرک کرنے کا موجب ثابت ہوتا ہے اور شکر سے غفلت نعمت کے زوال کا موجب بن جاتی ہے۔ یہ دونوں ہمارے سامنے ہیں خواہ ہم یہ اختیار کر کے مزید انعامات کے مستحق بن جائیں یا شکر سے محروم ہونے کے بعد ہلاکتوں کو دعوت دینے لگیں۔ قدرت کی طرف سے ہمیں دونوں کا اختیار دیا گیا ہے۔

جنت کی شادابیاں

خدا تعالیٰ کے مقبول بندوں کی علامت یہ ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے والوں کی روح بھی عشق الٰہی کی مستی میں سرشار رہتی ہیں۔ ان کے اعمال میں خود بخود انقلاب پیدا ہونے لگتا ہے۔ خوشبو سے انسان غیر ارادی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ آگ اور [illegible] ہو جائے گی۔ ایمان کی حرارت بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ شرط یہ ہے کہ ایمان کی دولت سے نوازے ہوئے ہوں۔ جو اصلاح کے مدعی زندگی بھر اپنے پاس بیٹھنے والوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ سوز، وہ مستی اور شیفتگی، تابانی جو مومن کا امتیازی

وصف ہوتا ہے کسی ایک انسان کو بھی علماً نہیں کر سکتے وہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ مومن سے ربط ضبط رکھنے والا کبھی عشق کی مستی سے محروم نہیں رہتا۔ اس کے کردار میں ایمان کی جھلک پیدا ہو کر رہتی ہے عمل سے بڑھ کر کوئی قوت نہیں۔ یقین کا استحکام یقین پیدا کر کے رہتا ہے پاکانِ بارگاہ کی سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی صحبت انسان ساز تھی، دلوں کے میل دھو دیتی تھی اور ان کیفیتوں سے شناسا کر دیتی تھی جو ایمان کی جان ہوتی ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جن کی ذہانتیں آفتاب سے زیادہ درخشاں اور تاباں ہیں خود فرماتے ہیں، کہ مجھے حضرت ایوبؒ سختیانی کی صحبت نے غیر معمولی فائدہ بخشا ہے۔ حضور علیہ السلام کی ذات گرامی سے ان کے عشق کا یہ عالم تھا کہ بیشتر اوقات کوئی حدیث بیان کرتے وقت ان پر عشق و مستی کا یہ عالم طاری ہو جاتا تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ جاری ہو جاتا اور ان کی حالت دگرگوں ہو جاتی یہی عشق تو امام مالکؒ کے شفیق استاد کا سرمایہ حیات تھا۔ شاگرد کے رگ و ریشے میں سرایت کر گیا۔ اور وہ اپنے بزرگوں کی اس میراث کو لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے، دوسروں کو بھی انہوں نے اس میراث میں حصہ دار بنا یا جو متاع اپنے پاس تھی۔ نہایت فیاضی سے تقسیم

کی۔ حدیث کا کوئی منکر اس متاع سے حصہ گیر نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی عشقِ رسول ﷺ میں اس کی آنکھیں تر ہو سکتی ہیں اور نہ ہی کسی سینے میں ان کیفیتوں کو بیدار کر سکتا ہے جن کی بدولت صحابہؓ بے سروسامان ہونے کے باوجود دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ سوز سے محرومی، عشق سے بیگانگی اور ذوق و شوق سے ناآشنائی حدیث سے انکار کا لازمی نتیجہ ہے۔ آئمہ شریعت اور آئمہ طریقت کے دامن میں یہ متاع موجود تھی تو عشقِ رسول ﷺ کا فیضان تھا۔ نسبت ہی نہ ہو تو سوز کیسا؟

سوز و گداز تو محبت کے فیوض ہوتے ہیں۔ خاکم بدہن محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی نفی کرنے کے بعد سوز و گداز کہاں سے مل سکتا ہے، تپش آگینی کیسے میسر آ سکتی ہے، آنکھوں میں آنسوؤں کے وہ خزینے کہاں سے آ سکتے ہیں جن کی قیمت خریدار ہوتی ہے۔ محبت کا بازار دنیا کے بازاروں سے بڑھ کر مختلف بازار ہے۔ یہاں قبولیت اسی جنس کو ملتی ہے جو محبت کی منڈی سے لائی گئی ہو۔ [illegible] صدیقؓ و بلالؓ [illegible] عشق کے [illegible] سے کٹ کر [illegible] تو ہو سکتا ہے [illegible] کیفیت [illegible]

دانی کا دل ہے یہیں سے ملا تھا اور یہیں سے ملے گا۔

ایمان اور توبہ

محبت کے بغیر کسی ذات کی کامل اطاعت ممکن نہیں۔ قانون کے خوف سے اگر کوئی اطاعت گذار بن بھی جائے تو اس کی اطاعت کی حدود وہیں تک ہوں گی جہاں تک قانون کی رسائی ممکن ہو۔ قانون کے ذریعہ دل کو مسخر نہیں کیا جا سکتا۔ دل کی تسخیر محبت ہی سے ممکن ہے۔ اس لیے ایمان کا معیار تجویز کیا گیا ہے قلبی تصدیق کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ عقل کو اولیت حاصل ہوتی تو تکمیل ایمان کے لیے قلبی تصدیق کی بجائے ذہنی تصدیق کو ضروری قرار دیا جاتا۔ لیکن اس بارگاہ میں عقل معتبر نہیں دل کے فیصلے معتبر ہیں۔ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے والے یہ نہیں سوچتے کہ ایمان قلبی چیز ہے عقلی نہیں۔ غیب پر ایمان لانے کے لیے عقل کب تیار۔ وہ کسی وقت نادیدہ محبوب کی طلب میں صرف محبت ہی چوٹ کرتی ہے عقل تھک جاتی ہے۔ اور ساتھ پردوں میں چھپے ہوئے حسن کی حقیقتوں سے آشنا بھی نہیں ہو سکتی ہے دل ہی نہیں دل ہی پا سکتا ہے عقل کو محرم راز بننے کی سعادت نصیب نہیں ہو سکتی۔ وہ ہمیشہ نامرادوں کی دنیا ہے

عقل کو یہیں عقال کے مجنون دائرے ہیں جہاں وہ اپنی جولانیاں دکھا سکتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ تسلیم کرا لیتی ہے کہ محبت کی دنیا میں اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہاں پہنچ کر نہ اس کی قوت پرواز باقی رہتی ہے نہ اس کے وہ دم خم ہوتے ہیں جو وہ اپنی حدود کے اندر رہ کر دکھا سکتی ہے۔ لیلیٰ کو دلیل سے تو پایا جا سکتا ہے لیکن محبت کے فیصلوں کو دلیل نہیں توڑ سکتی یہاں آکر ایسے سپر انداختہ ہونا پڑتا ہے

صحابہ کی محبت چونکہ سچی اور راسخ تھی اور پختہ تھی اس لیے انہوں نے نبوت کے فیصلوں کو کبھی عقل کی ترازو میں رکھ کر تولنے کی کوشش نہیں کی۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے وہ چیز جانی جاتی ہے جو کثیف ہو لطیف کو کبھی کسی نے تولا ہے۔ محبت خود لطیف ہے اس سے پیدا شدہ جذبات بھی لطیف ہوتے ہیں۔ لطافت کو محسوس کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق عقل کی میزان سے نہیں احساسات سے ہوتا ہے۔ خوشبو لطیف ہے دکھائی نہیں دیتی محسوس کی جاتی ہے۔ اب اگر عقل کا دعویٰ بلند بانگ اسے تولنے کی کوشش کرنے لگے تو اسے بجز فتور العقل ہونے کے اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ محبوب کے فیصلے عقل میں تلنے والی چیز ہوتے تو پہاڑ ثابت کر دیے تھے جاننے والے مشتاق نہ جانے کتنے ترازو ایجاد کر چکے ہوتے۔ محبوب کے فیصلوں کو تو احساسات کے ذریعہ ہی جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ جو احساسات ہی ان کی حقیقت سے آگاہ ہو سکتے ہیں اور ان

کی قدر کر سکتے ہیں۔ احساسات ہی مردہ ہوں تو وہ کیا سمجھیں گے اور کیا لطف اندوز ہوں گے؟

اسی لیے اسلام نے دل کی زندگی پر زور دیا ہے۔ آخرت میں بھی انہی لوگوں کی پذیرائی ہو گی جو قلب سلیم لے کر حاضر ہوں گے عقل کی طرف کا یہاں لے کر حاضر ہونے والوں کا کوئی مذکور نہیں۔ دل کو قیل و قال سے زندگی نہیں ملتی۔ اس کھیتی کو سرسبز و شاداب کرنے کے لیے آنسوؤں کا پانی درکار ہوتا ہے اور آنسوؤں کا پانی عقل کے دامن میں نہیں یہ رم جھم محبت کی زمین سے اٹھنے والے بادلوں کے خزانہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بارش بالعموم گرد آلود مطلع کو صاف کر دیتی ہے۔ فضاؤں کے حسن کو نکھارتی ہے وہی فضائیں جو دھندلی نظر آتی ہیں۔ دل فریب نظر آنے لگتی ہیں۔ یہی حال دل کا بھی جب ندامت کے آنسو برستے ہیں تو گناہوں کی گرد دھل جاتی ہے دل کی فضاؤں میں نیا حسن اور نیا نکھار پیدا ہو جاتا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس باغ پر کبھی خزاں آئی ہی نہ تھی۔ خزاں نے برگ و بار کو تباہ نہیں کیا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ گناہوں سے توبہ کرنے والا یوں پاک ہو جاتا ہے جیسے اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ نئی بہار کے آنے کے بعد چمن کی رعنائیاں خزاں کے اثرات زائل کر دیتی ہیں۔ توبہ بھی حیات انسانی کے مرغزاروں پر ایسی ہی بہار کی حیثیت رکھتی ہے

محبت کی سوداگری

اعتماد، تعلق کی جان ہوتا ہے، جہاں تعلق ہو، اعتماد بھی ہوگا۔ مریض کو ڈاکٹر کی ذات پر اعتماد ہوتا ہے، تو وہ اس کے عمل جراحی سے بھی نہیں گھبراتا۔ جسم کا حصہ کاٹ کر پھینک دینے سے بھی اس میں بے اعتمادی پیدا نہیں ہوتی۔ تعلق کا نام ہی یہ ہے کہ وہ بد اعتمادی کو قریب نہیں پھٹکنے دیتا۔ جہاں بے اعتمادی پیدا ہو جائے، وہاں تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے۔ تعلق جب تک باقی رہتا ہے، اعتماد بھی قائم رہتا ہے۔ بد اعتمادی عدمِ تعلق کی دلیل ہوتی ہے۔ اسلام میں مایوسی کو کفر کیوں کہا گیا ہے؟ اسی لیے کہ یہ تعلق کے ٹوٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جب بندے کا مولا سے تعلق ٹوٹ گیا تو اسلام کیسا! ایمان کے کیا معنی؟ ایمان تو محبت ہے اور محبت کسی حال میں بھی مایوس ہونا نہیں جانتی۔ محب نزع میں گھر کر بھی دوست کی مدد کی امیدوار رہتی ہے۔ مدد نہ پہنچنے پر بھی وہ اس خیال میں مبتلا رہتی ہے، کہ دوست کو میرے حال کی خبر نہیں ہوئی۔ میری پریشانیوں سے آگاہ ہونے کے بعد وہ میری مدد کو ضرور پہنچ گیا۔ ناممکن ہے کہ

میرا بُرا حال ہوا۔ اس کے سینے میں کوئی ٹیس نہ اٹھے، محبت کا کوئی جذبہ بیدار نہ ہو۔ اور اسے میری مدد کا خیال نہ آئے۔ اسے دکھ پہنچانے کی کوشش کی جائے کہ تمہارے دوست نے جان بوجھ کر تغافل برتا ہے، لیکن بات یقین نہیں آئے گا۔ جذبات کی صداقت یہی کہے گی کہ تم جھوٹ کہتے ہو، میرا دوست ایسا نہیں۔ وہ مدد کو ضرور پہنچے گا، مدد کے بغیر اسے چین نہیں آسکتا۔ ایسے تمام تر جذبات تعلقِ خاطر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جہاں تعلق نہ ہو، وہاں صداقت کا خیال بھی نہیں آتا۔ اس پر کوئی اعتماد نہیں کرتا، اور مصائب و آلام میں گھر کر نظریں اس طرف نہیں اٹھتیں، اسے نہیں پکارا جاتا۔ پکارا اسی کو جاتا ہے جو دل میں بسا ہو، جو رگ رگ میں سمایا ہو، جس کی یاد کو دل پذیر اور جاں نواز سمجھا جائے۔ محبت ہمیشہ خوش گمان ہوتی ہے۔ وہ دوست پہ بداعتمادی کو کفر جانتی ہے۔ اعتماد ہی اس کی جان ہوتا ہے، اور اعتماد ہی سرمایہ حیات، وہ جان دے کر بھی یہ سرمایہ ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ محبت کے دامن میں سب کچھ لٹ جانے کے بعد وہ ساری ذلتیں اور رسوائیاں برداشت کر لینے کے باوجود بھی اگر اعتماد کا سرمایہ موجود ہو تو وہ سرمایہ دار کہلاتی ہے۔ ناداروں کے دامن اس کی جھولیاں بھرتے ہیں۔ دنیا کی عظمتوں اور دولتوں کو وہ ہیچ جانتی ہے۔ وہ غلطی تو اس وقت ہے جب اس کا سرمایہ حیات لٹ جائے۔ وہ ساز و سامان

ختم ہو جائے جس پر اس کی حیات کا دار و مدار ہوتا ہے۔ محبت کا سرمایہ قارون
کے خزانے نہیں ہوتے۔ یہی یقین و اعتماد اس کی دولت ہوتی ہے، اور
اس نے ہمیشہ اسی دولت پر ناز کیا ہے۔ اسی کو عزیز جانا ہے۔ اسی کی
طلب کی ہے، اور اسی سے تاب و تواں حاصل کی ہے۔ چراغ میں
تیل ختم ہو جائے۔ تو وہ بجھ جاتا ہے۔ کسی کو نور عطا نہیں کر سکتا۔ محبت
کے چراغ کی ساری نور پاشیوں اور جان نوازیوں کا انحصار یقین و
اعتماد پر ہوتا ہے، اسی سے اسے زندگی ملتی ہے، اور اسی سے فروغ حاصل
ہوتا ہے۔ جس حیات کا دامن یقین و اعتماد کی دولت سے خالی ہو اسے
نہ ہی زندگی مل سکتی ہے، اور نہ ہی فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ کسی پر اعتماد
نہ کیا جائے تو وہ مدد کو کیسے پہنچ سکتا ہے؟ پکارا نہ جائے تو لبیک کی
صدا کہاں سے آئے گی؟ محبت کی پکار کبھی رائگاں نہیں گئی۔ اس کے
اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں لگی۔ اس نے جب بھی پکارا ہے کامیاب ہوئی ہے
جب بھی اعتماد کیا ہے نوازی گئی ہے۔ نوازش و کرم اس کا حصہ ہے۔
التفات و عنایات اس کا مقدر ہیں محرومیاں تو ہوس کا حصہ ہیں جو ازل سے محروم چلی
آ رہی ہے اور اب تک محروم رہے گی۔ اس کی صداؤں میں نہ کبھی
اثر پیدا ہوا ہے اور نہ ہی اس کی آواز پر کسی کا دل پسیجا ہے۔ بلال کی
صدا پر حضور کا قلق و اضطراب کیا تھا؟ وہ محبت کی پکار کا جواب ہی

تو تھا جس نے صدیق رضؓ کو سارا سرمایہ حیات لے کر آپ کے دروازے پہ دستک دینے کے لیے مجبور کر دیا تھا وہ خریدار بن کر پہنچ گئے۔ خریدار کون تھا؟ وہ بھی محبت ہی تھی جو صدیق رضؓ کے لباس میں طالب بن کر کھڑی تھی۔ محبت جب بکاؤ مال بن کر بازار میں آجاتی ہے تو محبت ہی کو خریدار بن کر نکلنا پڑتا ہے ہوس نہ کبھی بکی ہے اور نہ اسے کسی نے خریدا ہے۔ تڑپنا اور تڑپانا، مضطرب ہونا اور مضطرب کر دینا صرف محبت کا کام ہے، وہ سب کچھ نثار کرنے کے بعد بھی یہی کہتی ہے کہ سستا خریدا، مال گراں تھا سستا مل گیا، ورنہ جان کی قیمت بھی کوئی قیمت ہے؟ اس متاع کی قیمت تو دونوں جہان بھی نہیں ہو سکتے۔

سکون اور محبت

اندھے کی لاٹھی اس کی رہبری نہیں کرتی بلکہ اندھے کا وہ ارادہ ہی کار رہنما بن کر اسے واصلِ منزل کر دیتا ہے۔ جو محبت کے بطن سے ظہور پاتا ہے۔ دل میں لگن موجود نہ ہو تو دو قدم چلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ لگن ہی ولولۂ شوق بخشتی ہے اور لگن ہی رہنما بن کر کشاں کشاں منزلِ شوق پہ پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ محبت کو اسی لیے ایمان کی اساس بنا

بنیاد قرار دیا گیا ہے کہ یہی اعمال کی خالق ہوتی ہے۔ سرفروشیوں اور جاں
نثاریوں کا جذبہ اسی کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔ یہ خود سرفروش ہے
اسی لیے سرفروشی کی تعلیم دیتی ہے۔ یہ خود جاں نثار ہے اسی لیے وہ
جاں نثاری کے جذبات کی تخلیق کرتی ہے۔ عقل نہ سرفروش ہے نہ جاں نثار۔
وہ سرفروشی کے جذبات پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ سعادت ازل ہی سے
محبت کے حصے میں آئی ہے بدر و حنین کے معرکے کیا تھے؟ محبت
کے ولولہ انگیز مظاہر۔ صحابہؓ کی جاں نثاریاں کیا تھیں؟ عشق کی مرتب
داستانیں اور جذبات کے سمندر کی ابھرتی اور مچلتی ہوئی موجیں، جو کفر و
شرک کی دیواروں سے ٹکرا کر انہیں پاش پاش کر دیتی تھیں۔ موج کی
فطرت میں اضطراب ہوتا ہے وہ انجام سے بے نیاز ہو کر ٹکراتی ہے
یا مٹ جاتی ہے اور یا ساحل کو آغوش میں لے کر روپوش ہو جاتی ہے
دریا ہی سے اٹھتی ہے اور دریا ہی میں غائب ہونے کے بعد اسے سکون
ملتا ہے۔ مومن کا وجود بھی دریائے معرفت سے ابھرنے والی موجوں کی حیثیت
رکھتا ہے۔ وہ دریائے ناپیدا کنار کے سینے سے ابھرا ہے اور اسی میں سکون
پذیر ہو کر اسے چین آ سکتا ہے۔ مضبوط چٹانوں کی دیواریں اس کی راہ نہیں
روک سکتیں۔ راہ میں جو بھی آئے گا پاش پاش ہو کر رہے گا۔ ریزہ ریزہ
ہو گا۔ اور اگر خس و خاشاک کے انبار اس کی راہ میں حائل ہو کر اس کی رفتار

روک دیں اس کے اضطراب شوق میں کمی کا موجب ثابت ہوں تو اس کا ایمان مضبوط نہیں یعنی دنیا نے کب موجوں کا راستہ روکا ہے کیا ان کی فطرت کو بدلا ہے اور ان کے پیچ و تاب میں کمی کا موجب ثابت ہوئے ہیں؟ چند تنکے اگر ان موجوں کا اضطراب کم کر دیں اس کی فطرت کو بدل دیں اور اس کے فطرت میں کمی کا موجب ثابت ہوں تو وہ موج موج نہیں۔ اسے زیادہ سے زیادہ چند حباب کی موزوں صورت کہا جا سکتا ہے۔ جو ایمان کفر سے خائف ہو، جو حق باطل کے سامنے جھک جائے اور جو محبت ہوس کے سامنے سپر انداختہ ہو جائے اس کی فطرت میں کجی ہے۔ جب حق کی بنیاد اخلاق کے ولولہ انگیز جذبات پر مبنی ہو وہ باطل کے سامنے سرنگوں نہیں ہو سکتا۔ ایمان کے ولولہ انگیز جذبات کا مالک انسان باطل کے سامنے نہیں جھک سکتا ہے وہ باطل کو ٹھکرا کر اور مٹا کر دم لے گا۔ باطل سے لڑتے ہوئے اگر اس کے جسم و روح کا پیوند بھی جدا ہو جائے اور حالات کے سمندر کی موجیں اسے نیم جان کر کے ساحل پر پھینک دیں تو اس کی روح پھر بھی شکست نہ کھائے گی۔ وہ خود کو انتہائی کامیاب اور بامراد سمجھے گا۔ محبت کی دنیا میں کامیابی کا جو مفہوم ہے وہ اس مفہوم سے یکسر مختلف اور جداگانہ ہے۔ جو ارباب ہوس نے قرار دے رکھا ہے۔ ان کے نزدیک کامیابی فتوحات سے عبارت ہے لیکن محبت کی تسخیر

ہوس کی کامیابی دنیا کے تمام فرمانرواؤں کی تسخیر اور کامیابی سے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں شکست کے بعد بھی راحت ہوتی ہے۔ سب کچھ لٹا دینے اور نچھاور کر دینے کے بعد جذبۂ محبت کی تسکین معرض وجود میں آتی ہے۔ ہوس دم توڑتی ہے تو ہوس کو اس پر نثار ہونے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی محبت بادۂ شوق میں مست ہے اس کا خون پیتا ہے تو وہ تاریخ محبت کا جزو بن کر دنیائے محبت کو نئی رنگینیاں عطا کر دیتا ہے۔ ان پر محبت بھی نثار ہوتی ہے۔ اور شوق بھی اہل محبت انہیں رنگینیوں سے تاب و تواں لے کر منزل شوق کی طرف نئے جذبے اور ولولے سے دوڑنے لگتے ہیں۔ ان کا اضطراب اس وقت تک کم نہیں ہوتا جب تک وہ محبوب حقیقی کی آغوش میں پہنچ کر سکون نہیں پا لیتے۔ ہوس کو ہوس کی آغوش میں سکون نہیں ملتا یہ محبت ہی کی فطرت ہے کہ وہ محبت کو آغوش میں لے کر سکون بھی پاتی ہے۔ اور سکون کی دولت بھی عطا کرتی ہے۔ خود بھی مطمئن ہے اور آغوش میں آنے والے کے زمانے کو بھی آسودگی بخشتی ہے۔ ہوس کی آغوش ازل سے سکون نا آشنا ہے یہ اہل محبت کا منصب ہے ورنہ نہیں جا کر رہتا ہے۔

رضا کی منزل

قدیم زمانۂ جاہلیت میں شعرائے عرب کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنے ممدوح کی بارگاہ میں پہنچ کر فوراً وہ قصیدہ پیش نہیں کر دیتے تھے جو انہوں نے اپنے ممدوح کی شان میں لکھا ہوتا تھا۔ ان کا پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ اپنے سواری کے جانور کی کونچیں کاٹ دیتے تھے اور تلوار توڑ دیتے تھے ایسا کرنے سے ان کا مقصود یہ ہوتا تھا کہ منزل پر پہنچ کر سامانِ سفر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ سواری کا جانور اس لیے تھا کہ اس کے ذریعے سفر قطع کیا جائے۔ تلوار جان کی حفاظت کے لیے تھی اب سفر بھی ختم ہو چکا ہے اور ایک عظیم قوت کی پناہ میں آجانے کے بعد امن بھی مل گیا ہے تو اب ان چیزوں کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

عارفینِ حق کا معمول بھی یہ ہے کہ وہ رضا کی منزل میں داخل ہونے کے بعد خواہشات کے گھوڑے کی کونچیں بھی کاٹ دیتے ہیں۔ اور اختیارات کی تلوار بھی توڑ دیتے ہیں۔ ان کا مقصود بھی یہی ہوتا ہے کہ رضا کی منزل میں داخل ہونے کے بعد ہمارا لوٹنے کا کوئی ارادہ نہیں

اب ارادہ ہمارا نہیں۔ ارادہ اس قادر قیوم ذات کا ہے جس کے حریم جمال کو ہم نے دارالامان کی حیثیت سے اختیار کر لیا ہے جہاں نہ کسی دشمن کا اندیشہ ہے نہ احتیاج کا غم بس امن ہی امن ہے۔ چین ہی چین ہے سکون ہی سکون ہے راحت ہی راحت ہے، یہ جگہ نہ سود و زیاں کے اندیشوں کی ہے نہ ذہنی و قلبی پریشانیوں کی۔ ذہنی اور قلبی پریشانیاں تو وہاں ہوتی ہیں جہاں میزبان مہمان کی ضرورتوں سے ناواقف ہو یا اس کی فطرت میں بخل ہو۔ اسے اپنے خزانے کے گھٹنے کا اندیشہ دامن گیر رہے۔ اور اسی اندیشے کے پیش نظر وہ مہمان کی ضرورتوں سے صرف نظر کرے۔ اس بارگاہ میں ایسی کوئی صورت متصور نہیں ہو سکتی۔ نہ میزبان کا علم ناقص ہے کہ اسے مہمان کی ضرورتوں کی خبر نہ ہو۔ اور نہ ہی اس کے خزانے محدود ہیں اور اس کے علم کی بھی کوئی حد نہیں۔ اور اس کا دریائے جود و کرم بھی بے پایاں ہے پھر مہمان نوازی میں کیا کسر باقی رہ سکتی ہے؟ دنیا والوں کا بھی جب یہ دستور ہے کہ مہمان کی تواضع اور خدمت میں کمال درجے کی فیاضی اور فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہیں؛ تو اس کریم ذات سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ رضا کی منزل میں آجانے والے مہمان کو بھوکا پیاسا رکھے گی اس کے جذبات و احساسات کی رعایت نہیں برتے گی؟ دنیا کا مہمان تو اپنے میزبان کے محدود علم کی

بنا پر ہو سکتا ہے۔ کہ اس کی تمام کوششوں اور کاوشوں کے باوجود کبیدہ خاطر رہے۔ میزبان اس کے ذوق کی تشنگی کو ملحوظ رکھے لیکن اس کے جذبات کا اندازہ لگانے سے قاصر رہے۔ خدا کے مہمان کو یہ صورت پیش نہیں آسکتی۔ وہ سمیع بھی ہے اور بصیر بھی، علیم بھی ہے اور خبیر بھی، اس سے نہ ظاہر چھپا ہے نہ باطن، نہ خیالات کی رو اس کی دسترس سے باہر ہے، اور نہ ہی احساس کی دنیا کا کوئی گوشہ اس کے علم سے باہر ہو سکتا ہے۔ احساسات کے تاروں سے نکلنے والے نغموں کی ہر لَے سے بھی وہ واقف ہے اور افکار و خیالات کے حجابوں میں چھپی ہوئی ہر حقیقت بھی اس کی نظروں کے سامنے ہے۔ اس کی مشیت کے سامنے ظاہر و باطن یکساں ہیں۔ ایسی ذات اگر مہمان نواز بن جائے اور کسی مہمان کو اس کی مہمان نوازی کا شرف حاصل ہو جائے تو اسے کس چیز کی ضرورت باقی رہ سکتی ہے؟

ہر میزبان کی نعمتیں اپنے دوستوں کے لیے وقف ہوتی ہیں۔ دشمن کو اپنے گھر میں کون ٹھہراتا ہے؟ اس کی خاطر و مدارت کون کرتا ہے؟ خصوصاً جب کہ یہ معلوم ہو کہ آنے والے کی نیت ٹھیک نہیں یہ ہمارے دشمن کا کارندہ ہے اور اس کی تمام صلاحیتیں اس کی رضا جوئی کے لیے وقف ہیں۔ شیطان کے کارندے رحمان کی بارگاہ میں مہمان نوازی

کا لطف نہیں اٹھا سکتے یہ سعادت ان ہی لوگوں کا حصہ ہوتی ہے، جو شیطان سے کٹ کر رحمان کے ہو جاتے ہیں۔ رحمان ہی کی بارگاہ ان کی آخری پناہ گاہ قرار پاتی ہے۔ سکون بھی ان کے لیے ہوتا ہے اور راز و نیاز کی لذتیں اس پر مستزاد ہوتی ہیں۔ کیونکہ رازمیں دوست کو شریک کیا جاتا ہے، دشمن کو نہیں۔ دشمن سے تو راز چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ متقیوں پر اسرارِ معرفت کھلتے ہیں۔ گمراہ انسان نہ قرآن کے اسرار و معارف سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان پر معرفت کی راہ کھلتی ہے۔ قرآن ان کی مزید گمراہی کا موجب بن جاتا ہے۔

جلوہ گر اور جلوہ گری

دنیا کی بارگاہوں میں مقبول بننے کے لیے ظاہری آسائش و زیبائش کی ضرورت ہوتی ہے لیکن خدا کی بارگاہ میں مقبول بننے کے لیے باطنی تطہیر کی ضرورت ہے۔ اہل دنیا کی نظریں چونکہ محدود ہوتی ہیں ظاہری پر پڑتی ہیں اور ظاہری کو دیکھ کر فیصلے کرتے ہیں۔ اس لیے ظاہری حال ہی ان کے نزدیک انسانی مجد و شرف کا موجب بنتا ہے باطن سے انہیں کوئی سروکار

نہیں جچتا۔

خداتعالیٰ کی بارگاہ میں مقرب بننے کا معیار چونکہ باطنی تطہیر ہے۔ وہ پاکیزگی ہے جو آلائشوں سے پاک ہو جس کے آئینے کو معصیت کے گرد و غبار سے محفوظ رکھا جائے اس لیے کہ خدا تعالیٰ ظاہر کو نہیں باطن کو دیکھتا ہے۔ اور باطنی تطہیر ہی کی نسبت سے انسان کو اپنا قرب خاص عطا کرتا ہے۔ تطہیر جتنی اعلیٰ ہو گی باطن اتنا اجلا ہو گا۔ اس کی نسبت سے قرب حاصل ہو گا۔ ظاہر خواہ کتنا بھی آراستہ و پیراستہ کیوں نہ ہو اگر باطن درست نہ ہو، باطن میں گناہوں کے اندھیرے چھائے ہوں تو اس میں نور فیض ریز نہیں ہو سکتا۔ ہر حسین کو اجلا آئینہ درکار ہوتا ہے۔ جس میں وہ اپنے جمال کی تابشیں دیکھ سکے۔ ان نقش و نگار کا مشاہدہ کر سکے جو حسن کے حسن و جمال کے مظہر ہوتے ہیں۔ اور جن کے ذریعہ جمال کی بے پناہ تابشیں

وہ گرد و غبار سے اَٹے ہوئے اور جوہر سے محروم آئینے کو ظاہری حسن کی نگاہیں جمال بینی کے لیے منتخب نہیں کرتیں۔ پاک صاف اور شفاف آئینے ہی کو حسن نے ہمیشہ اپنی جمال بینی کے لیے منتخب کیا ہے حسن مطلق کی نگاہوں میں بھی وہی آئینہ قابلِ تکریم قرار پاتا ہے، جو دلآ ویز و حسین و جمیل ہو جس میں حسن کے جلوے سمٹتے اور

آشکارا کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ دل میں بھی اگر صلاحیت پیدا ہو جائے تو وہ محرومِ جمال نہیں رہتا۔ ناقابلِ التفات نہیں سمجھا جاتا۔ اس پر توجہ ہوتی ہے۔ حسن برافگندہ نقاب ہو کر اس کے سامنے آتا ہے۔ اسے اپنے جمال کی لطافتوں سے نوازتا ہے اور اسے پیشِ نظر رکھ کر اس کے ذوقِ جمال کو تسکین دیتا ہے اپنی ذات صفات کا مظہر ہے۔ ذات کو عزیز ہوتا ہے۔ صفات کا مظہر بن جاتا ہے تو اس میں صفات جلوہ ریز ہونے لگتی ہیں۔ ذات کو ذات میں سمیٹ لیتا ہے۔ تو ذات آشکارا ہونے لگتی ہے۔ ذات میں جو خصوصیات ہوتی ہیں انہی کے عکس سے اپنی ذات متجلی اور مستنیر نظر آنے لگتی ہے۔ اپنے حسن کی تجلیوں کو کوئی ذات ضائع نہیں ہونے دیتی۔ کوئی حسین اپنے آئینے کا ٹوٹنا گوارا نہیں کرتا۔ آئینہ اسے اس لیے عزیز ہوتا ہے کہ وہ اس کے حسن کا مظہر ہوتا ہے۔ دل بھی جب تجلیات ربانی کا مظہر بن جاتا ہے تو اس کی حفاظت شانِ حقیقی کے ذمے ہوتی ہے۔ وہ ٹوٹنے سے بھی محفوظ رہتا ہے اور گرد و غبار بھی اس کے جمال کی لطافتوں کو مجروح نہیں کر سکتے۔ حسنِ مطلق اس کی ذات و صفات دونوں کی حفاظت کرتا ہے۔ حسن کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے جمال کے آئینے کو شکست و ریخت سے محفوظ رکھنے کے لیے اتنی ہی رفیع منزلت رکھتا ہے۔ گرد و غبار صاف کرنے کے لیے حسن

کے ہاتھ بڑھتے ہیں۔ اس کی حفاظت کو وہ اپنے جمال کی لطافتوں کی حفاظت کو وہ اپنے جمال کی لطافتوں کی حفاظت کے مترادف سمجھتا ہے۔ احساس کے اس اشتراک کا باعث وہ لطافتیں ہوتی ہیں جو حسن اور آئینے میں مشترک ہوتی ہیں۔ یہ وجہِ اشتراک ختم ہو جائے تو دونوں میں کوئی نسبت نہیں رہتی۔ ایک کی دوسرے سے نسبت ختم ہو جاتی ہے نہ آئینہ ہی حسن کے پیشِ نظر رہتا ہے اور نہ اس کی پامالی ہی حسن کو پریشان کرتی ہے۔

دل کو بھی حسنِ حقیقی سے کوئی نسبت نہیں رہتی تو اس کی پامالی حسنِ حقیقی کے دل میں اضطراب پیدا نہیں کرتی۔ اضطراب اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب دل میں مظہرِ ذات و صفات بننے کی صلاحیت موجود ہو۔ وہ ذات کو بھی آشکارا کرے اور صفات کو بھی۔

ظاہر اور باطن

گلاب کا پھول کسی کمرے میں رکھ دیا جائے تو پوری فضا مہک اٹھے گی۔ غلاظت موجود ہو تو دماغ پھٹنے لگے گا۔ جس طرح گلاب کی خوشبو سے کیف گیر ہونے کے لیے کتابوں کے ذریعے حاصل کیا گیا۔ علم کام نہیں دیتا۔ مشامِ جاں کو معطر کرنے کے لیے گلاب کے پھول کا پاس

ہونا ضروری ہے۔ ایسے ہی ایمان کا علم بھی اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتا جب تک سینہ ایمان کی دولت سے مالا مال نہ ہو۔

یہ ممکن نہیں کہ گلاب کا پھول موجود ہو اور قریب بیٹھنے والوں کو خوشبو نہ آئے۔ ایمان کی دولت بھی اگر پاس ہو تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کے شیریں ثمرات سے دوسرے لطف اندوز نہ ہوں۔ گلاب کے ایک پھول میں دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہے تو یہ سمجھ لیا جائے کہ ایمان، گلاب کے پھول سے بھی کم تر درجہ کی چیز ہے جس میں دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت نہیں ہے؟ جس طرح کاغذ کے پھول محض نمائشی ہوتے ہیں ان سے خوشبو نہیں آسکتی۔ ایسے ہی نمائشی ایمان سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ دوسروں پر کوئی مفید اثر ڈال سکے گا۔ ایمان وہی سودمند ہو سکتا ہے جو رگ و ریشے میں بسا ہو، حوادث کی آندھیاں جسے متزلزل نہ کر سکیں۔ حیاتِ انسانی اگر اضطراب و انتشار کا مورد بنی ہو۔ نہ دل میں سکون ہو نہ زبان پر خدا کا نام۔ بدگوئی، بدزبانی اور ایسی ہی بری صفات انسان سے چمٹی ہوں۔ تو انہیں ایمان کے ثمرات نہیں کہا جا سکتا۔

درخت اگر پھلوں سے پہچانا جاتا ہے تو مومن کو جانچنے کا معیار بھی اس کے اعمال ہیں، جہاں اعمال کی دلکشی نظر آئے۔ گفتار میں صداقت، کردار میں حیا و زینت و کشش دکھائی دے تو اسے ایمان کی علامت کہا جا سکتا

ہے۔ اس عاشق کے متعلق آپ کیا رائے قائم کریں گے جو کسی محبوب کی محبت کا دم بھی بھرے، اپنی چرب زبانی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش میں بھی مصروف ہو کہ محبوب سے زیادہ اسے کوئی چیز عزیز نہیں لیکن وہ اس کی رضاجوئی کے لیے اپنا معمولی سا مفاد بھی قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہو، شب و روز ان فوائد کو حاصل کرنے کی فکر میں رہے جو اسے محبوب کی ذات سے وابستگی کے بعد حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن اپنے مفاد کی فکر میں ہو۔ ایسی مصنوعی محبت بھی کس کام کی؟ دوست اسے مطلب پرست جان کر کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے مالک حقیقی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ہم اس کی محبت کا دم بھی بھریں اس کی بندگی کا اعتراف بھی کریں۔ لیکن اس کی رضاجوئی کے لیے اپنا معمولی سا مفاد قربان کر دینے کے لیے تیار نہ ہوں۔ اور وہ ہمیں اپنے خاص بندوں کی صف میں شامل کرے؟

سوال یہ ہے کہ کیا بندگی کے بھی کچھ تقاضے ہیں یا نہیں؟ کیا عمل کی قوت سے محروم ایمان خدا تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کافی ہو سکتا ہے؟ ایمان کا یہی مفہوم ہے کہ مسلمان بن کر اور مسلمانوں کی صف میں شامل ہو کر ہمیں جو فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کے حصول کے لیے تگ و دو میں مصروف رہیں۔ لیکن بندگی کے ان تمام تقاضوں کو نظر انداز کر دیں۔ جو ایک مومن کا امتیازی وصف ہوتے ہیں ایسی بندگی سے خود کو

فریب دینے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا اور اس طرح کے لوگ جو محض ذاتی مفاد حاصل کرنے کے لیے کسی جماعت میں شامل ہو جائیں جماعت کے لیے مفید نہیں ہوتے۔ شمولیت انہی لوگوں کی قابل فخر ہوتی ہے جو اخلاص کا پیکر ہوں۔ ایثار ان کی فطرت میں ہو اور جماعتی مفاد کے لیے انہیں جو نقصانات پہنچیں ان سے کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ بلکہ ان نقصانات کو فخر و مباہات کا موجب جان کر قدم آگے بڑھائیں۔ کم ہمت، خود غرض اور دوں فطرت لوگ جہاں کہیں بھی ہوں گے ننگ زیست کا سامان بن جائیں گے۔ اور اسلام دامن میں تو ایسے لوگوں کے لیے مطلقاً کوئی گنجائش نہیں۔ یہ شیر مردوں، غازیوں اور شہیدوں کا دین ہے۔ وہ ایسے ہی لوگوں کو پیار کی نظر سے دیکھتا ہے۔

محبّت کا جام

سفر میں لگن ہی ایک مسافر کا قیمتی اثاثہ ہوتی ہے۔ ساز و سامان کی فراوانی کے باوجود اگر دل جذبات سے خالی ہو تو دشوار گزار راہیں عبور نہیں کی جا سکتیں۔ بعض سفر صرف عقل سے طے کیے جا سکتے ہیں۔ اور عشق میں جذبات کی تند و تیزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جذبات میں تلاطم موجود نہ ہو تو انجام کی ہلاکت خیزیوں کا تصور دو قدم بھی چلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ بلبلہ جذبات

سے معمور ہو اور منزل کی طلب طوفان بن کر ظاہر ہونے لگے تو نظر انجام کی
ہولناکیوں پر نہیں ہوتی۔ شوق کی فراوانی مشکلات کو آسانیوں میں تبدیل
کر دیتی ہے۔ آسان راہیں عقل کے ذریعے طے کی جا سکتی ہیں لیکن مشکلات
کے پیچھے چنگھاڑتے طوفانوں میں عقل کی مصلحت اندیشیاں کام نہیں دیتیں۔
یہاں سرشار جذبات کی ضرورت ہوتی ہے جو خود مست و سرشار ہوں
اور مست و سرشار کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

راہوں میں عقل کی مصلحت اندیشیاں مفید ثابت ہو سکتی ہیں اور وہ سفر
آسان کو آسان تر بنا سکتی ہیں، لیکن مشکلات کے طوفانوں میں گھری ہوئی
راہوں میں محبت کے دیوانہ پن ہی کا چراغ جل سکتا ہے۔ ہوش کی راہ
کو جوش کے ذریعے طے نہیں کیا جا سکتا، اور جوش کی راہوں میں ہوش کے چراغ
نہیں جل سکتے۔ یہاں انجام سے بے نیاز محبت کے جذبات ہی کو رہبر بنایا
جا سکتا ہے، انہی کی رہبری قبول کرنی پڑتی ہے۔ جذبات کی تند و تیز صہبا
سفر کے شدائد کو کم کر دیتی ہے۔ سفر کی سختی محسوس نہیں ہونے دیتی۔ کٹھن
سفر مستی کے بغیر طے نہیں ہو سکتا۔ دو قدم چلنے سے دل بیٹھنے لگتا ہے اور
حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔

مستی سے محروم مسافر سے حوصلہ شکن راہوں میں کسی حیرت انگیز کارنامے
کی توقع نہیں کی جا سکتی، وہ تھک کر بیٹھ جائے گا یا دو قدم چل

کروٹ آئے گا۔ مستی رفیقِ سفر ہو تو لوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دو قدم چل کر اور مشکلات کا اندازہ لگانے کے بعد لوٹنا عقل کا کام ہے۔ محبت کی مستی میں اٹھا ہوا قدم واپس نہیں لوٹتا۔ مستی کی فطرت ہی یہ ہے، کہ وہ آگے بڑھتی ہے۔ عقل کی طرح پسپائی اختیار نہیں کرتی۔ بدر و حنین کے مظاہر کیا تھے؟ کیا وہ عقل کی کارفرمائیاں تھیں، مصلحت اندیشیوں کے نتائج تھے؟ یہاں تو محبت کی وہی مستی کارفرما تھی، جو صحابہ کو مے خانۂ قدس سے ملی تھی۔ تیر کی کر مرحبا کی صدائیں کیا خاکی قلب سے نکل رہی تھیں، جو معمولی سی چوٹ کھا کر تلملانے لگتا ہے، اور سراسیمہ ہو جاتا ہے۔ یہ حضورؐ کی محبت ہی کی مستی تھی جو زخموں سے چور ہو کر دعا گو بن گئی تھی، اور ان زخموں کی لذت پہ نثار ہو رہی تھی جو اسے راہِ محبت میں پیش آ رہے تھے۔ دنیا میں بھی بعض لوگ عظیم کارنامے سرانجام دینے کے لیے شراب پیتے ہیں، اور بعض قومیں اپنے سپاہیوں کو کسی خطرناک محاذِ جنگ پر بھیجنے سے پہلے شراب کے ایک دو جام پلا دیتی ہیں۔ تاکہ مستی میں تکلیف کا احساس نہ ہو۔

خدا تعالیٰ بھی اپنے کسی بندے کو مشکلات سے گزر کر رضا کی منزل پہ پہنچنے کی توفیق عطا فرماتا ہے تو اسے اپنی محبت کا جام پلاتا ہے۔ محبت کی یہی مستی اسے ملامت سے بے نیاز کر دیتی ہے، تکلیف کا احساس نہیں ہونے دیتی۔

مستی موجود ہو تو خطرات میں کودنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ مستی نہ ہو تو معمولی حادثہ بھی جذبات کا نشہ اتار کر رکھ دیتا ہے۔

ایمان اور محبّت

تکمیلِ ایمان کے لیے تکمیلِ محبت ضروری ہے۔ ایمان کے خیابانِ گل میں اسی وقت بہار آتی ہے جب محبت صدیق بن جاتی ہے۔ محبت میں کھوٹ ہو تو ایمان میں کھوٹ ظاہر ہو کر رہے گا اور محبت آلائشوں سے پاک ہو تو ایمان امتحانات کی آگ سے گزرنے کے بعد بھی کندن کی طرح چمکے گا۔ مصائب و آلام کی آندھیوں میں اسی ایمان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے جس کی اساس محبت پر نہیں ہوتی۔ جس طرح جسم روح کے بغیر بیکار ہوتا ہے ہر وقت اس کے خراب ہونے کا احتمال رہتا ہے، ایسے ہی جو ایمان محبت سے خالی ہو نہ تو اس کی صورت ارتقا پذیر ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس سے ان صفات کا صدور ممکن ہوتا ہے۔ جو دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مردہ کیا ان میں دکھا سکتا ہے، اور دلوں کو اپنی طرف کیا مائل کر سکتا ہے؛ یہ سب زندگی کی علامات ہوتی ہیں۔ زندگی اس ایمان میں پیدا ہو سکتی ہے جس کی اساس محبت پر ہو۔ جو محبت کے سرچشمہ

سے فیض یاب ہو۔ جسم کی حیات مادی غذا پر منحصر ہے اور دل محبت سے زندگی پاتا ہے۔ ایمان کا مقام دل ہے، دماغ نہیں۔ عقل تو اپنی ہی ادھیڑ بن میں لگی رہتی ہے۔ وہ محبت کا مزا کیا چکھے گی؟ ایثار محبت کی فطرت ہے عقل کی نہیں۔ عقل تو مفاد پرست ہوتی ہے۔ خود غرضی اس کی طینت میں داخل ہے۔ اپنا گھر اجاڑ کر محبوب کا بول بالا کرنا محبت کا شیوہ ہے محبت سب کچھ نثار کرنے کے بعد بھی راضی نہیں ہوتی۔ یہی چاہتی ہے کہ ہزار جان ہوتی تو نثار کر دیتی اور عقل معمولی مفاد کی قربانی بھی نہیں کر سکتی صحابہؓ کو سب کچھ نثار کرنے کے بعد بھی قربانی کی ہوس باقی رہتی تھی۔ تو اس کی یہ وجہ تھی کہ ان کے دل محبت سے سیراب تھے۔ محبت ازل سے ایثار پیشہ ہے۔ ایثار ہی سے اسے زندگی ملتی اور ایثار ہی سے اسے سرمستی ناختیں نصیب ہوتی ہیں۔ ایثار کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ بلالؓ کی زندگی اسی سوز و گداز میں تھی جو انہیں عشق رسول نے بخشا تھا، امیہ بن خلف کے مظالم ان کی آتش ٹھنڈی نہ کر سکے، بلکہ ان کے عشق کی گرمی میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ امیہ کی بھڑکائی ہوئی آگ کو سرد کر دے، اس کی حرارت چھین لے۔ محبت کی آگ ہی میں یہ خاصیت ہے کہ وہ ہر آگ پر غالب آ سکتی ہے۔ آتش نمرود کو گلزار بنا سکتی ہے۔ جسم اگر اثر پذیر ہو بھی تو احساسات گل و گلزار بن کر مہکتے ہیں۔ قدرت بھی محبت ہی کے احترام کے لیے اپنے

قوانین بدل دیتی ہے۔ عقل کے احترام کے لیے کبھی کوئی قانون نہیں بدلا گیا۔ عقل کے لیے آتش نمرود کب گلزار بنی ہے؟ دریاؤں نے اسے کب رستہ دیا ہے اور صحراؤں کی وسعتیں اس کے قدموں کے نیچے سکڑی ہیں؟ محبت جب صحابہ رضؓ کے روپ میں تسخیرِ کائنات کے لیے نکلی تو یہ سب کچھ ہوا، دریا بھی مسخر ہوئے اور پہاڑ بھی، دراصل یہ تسخیر صحابہ رضؓ کی نہ تھی۔ ان کی اس محبت کی تھی جو ان کے سینوں میں موجزن تھی، جس ذات کے لیے ایثار کیا جائے اس کا اجر بھی اسی کے ذمہ ہوتا۔ صحابہؓ کی زندگی چونکہ سراسر ایثار تھی اس لیے جس ذات کے لیے وہ ایثار کرتے تھے ہر گام پر اس کی نصرتیں ان کے ساتھ ہوتی تھیں، جب انسان کے اندر ایثار موجزن نہ ہو، مفاد پرستی، دولت آسانی ہی اس کا شیوہ ہو تو اس کے لیے قوانین قدرت کیسے بدل سکتے ہیں۔ فرشتے آسمانوں سے نصرت و اعانت کے لیے کیسے اتر سکتے ہیں؟

فرشتوں کو آسمانوں سے زمین پہ کھینچ کر لانے کی قوت تو محبت میں ہے محبت نہ ہو تو خدا کی نصرت کیسی اور فرشتوں کا نزول کیسا؟

محرومی اور عطا

آج کا مقبول کل کا مردود ہو سکتا ہے اور کل کے مردود کو آج مقبولیت عطا ہو سکتی ہے۔ سابقہ جب بے نیاز ذات سے ہو تو احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض غلاموں کو آقا کی نوازش گستاخ بنا دیتی ہے اور ان کے اندر فساد کا مادہ پھوٹ پڑتا ہے اور بعض محجوب ہو کر زیادہ اطاعت گزاری میں لگ جاتے ہیں کہ جن عنایات کی ہم پر بارش ہو رہی ہے ہم اس کے اہل نہ تھے۔ ایک کے لیے چشمِ کرم ابتلاؤں کا موجب بن جاتی اور ایک مزید انعامات کا مستحق قرار پاتا ہے۔ مقبولیت اور مردودیت کا تعلق انسان کے اپنے گمان سے ہے۔ کسی ذات سے اچھا گمان قائم کر کے تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک دن مقبولیت عطا ہو کر رہتی ہے۔ حاتم طائی کو بھی بخیل جان کر نظر انداز کر دیا جائے تو محرومی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور جو ذات تمام تر جود و کرم ہو، عطا و بخشش اس کی عادت ہو، محروم لوٹانے سے زیادہ جسے بامراد لوٹانے میں مزا آتا ہو، اس کی بارگاہ سے تو محرومی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انسان اپنے اور حقیقی معطی کے درمیان جو حجابات قائم کر لیتا ہے وہ اس کے اپنے پیدا کردہ

ہوتے ہیں۔ ورنہ کوئی کریم ذات جس کی فطرت عطا و بخشش ہو اپنے اور سائل کے درمیان حجاب کو پسند نہیں کرتی سخی کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے دروازے کشادہ رہنے سے اس کے ظرف میں اور وسعت پیدا ہوتی ہے گدا کے دامن کی وسعت اس کے جذبۂ سخا کو اور زیادہ ابھارتی ہے اور سخا پر آمادہ کرتی ہے۔ گدا اور سخی کے درمیان اگر کوئی خلیج حائل کر دی جائے تو وہ سخی کے احساسات کا تار تار ہلا کر رکھ دیتی ہے اور سخی اس خلیج کو عبور کر کے گدا تک پہنچنے کے لیے بے قرار رہنے لگتا ہے۔ ہر کمال اظہار کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ پھول کے دل میں یہ آرزو چھپی ہوتی ہے کہ دنیا اس کا جمال دیکھے۔ اس کی نکہتوں سے کیف گیر ہو۔ آفتاب کی خوشی مستور رہنے میں نہیں بے حجابی میں ہے۔ دنیا کو اپنے نور سے منور کرنے میں ہے۔ سخی بھی اپنے جذبۂ سخائی نمود چاہتا ہے۔ اسی لیے دنیا کو اپنے نور سے نوازنے والے کریم نے اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ دنیا کے سخیوں سے بار بار مانگا جائے تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں ممکن ہیں ایسا کریم ہوں کہ مجھ سے نہ مانگا جائے تو مجھے قلق ہوتا ہے۔ سائل کے بار بار تقاضے سے دنیا کے سخیوں کو اپنے خزانے کے کم ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن بحر و بر کو اپنے خوان سے سیراب کرنے والے سخی کے خزانے کے کم ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ وہ خود محدود ہیں اس لیے ان کی عطا بھی محدود ہے اور ظرف بھی محدود۔ لامحدود وسعتیں رکھنے

والے خزانوں کے مالک کا ظرف بھی لامحدود ہے اور بخشش و عطا کا جذبہ بھی لامحدود۔ ذلتیں تو ان سائلوں کے مقدر میں ہوتی ہیں جو کریم کو چھوڑ کر بخیل کے دروازے پہ دستک دینے لگتے ہیں۔ لامحدود ذات کو چھوڑ کے محدود کے دستِ کرم کو حاجت روا سمجھنے لگتے ہیں۔ اعلیٰ بارگاہ سے وابستہ ہونے والے فقیر بھی بے نیاز ہوتے ہیں۔ بارگاہ جتنی اونچی ہوگی بے نیازی کی شان بھی اسی نسبت سے عطا ہوگی۔

خدا تعالیٰ کے مقبول بندوں میں بے نیازی کی جو شان پیدا ہو جاتی ہے اس کا باعث بھی یہی ہے کہ ان کا تعلق بے نیاز ذات سے ہو جاتا ہے وہ اسی کو اپنے لیے کافی سمجھ لیتے ہیں اور وہ ان کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ کسی بادشاہ کا غلام اگر بازار میں بھیک مانگتا نظر آ جائے تو وہ کشتنی قرار پاتا ہے۔ شاہ کی غیرت جوش میں آ جاتی ہے کہ ہماری بارگاہ سے وابستہ ہونے کے بعد یہ بھیک مانگ رہا ہے؟ ہماری آبرو خاک میں ملا رہا ہے؟ بندہ جب غیروں کے سامنے دامن پھیلاتا ہے تو مالکِ حقیقی کی غیرت جوش میں آ جاتی ہے کہ ہمارا کہلا کر یہ گدائی! یہ ذلالت! اور پھر ایسے بندے کو انہی کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا جاتا ہے جو ان سے نہایت سنگدلانہ سلوک کرتے ہیں۔

عتاب اور کرم

انسان سراسر احتیاج ہے اور خدا غنی جہاں بھی غنا کی شان نظر آتی ہے۔ سب اسی کے غنا کا پرتو اور عکسِ جمیل ہے۔ ماہ و نجوم کا نور ذاتی نہیں سورج کا عطا کردہ ہے یہ چشمۂ آفتاب کا فیضان ہے ایسے ہی بندے میں جو بھی خوبی ہے، وہ اسی قادر و قیوم ذات کی عطا و بخشش کا فیضان کہلائے گی جس نے ستاروں کو نور، آفتاب و ماہتاب کو دل آویزیاں، پہاڑوں کو جبروت، درختوں کو ایستادگی، سبزے کو شادابی اور دریاؤں کو روانی بخشی ہے۔ خوبی خواہ کسی بھی نوعیت کی ہو، وہ کسی کی ذاتی نہیں کہلا سکتی۔ گدا منعم کے دروازے سے خواہ کتنی وافر مقدار میں بھیک حاصل کر لے۔ گدا رہے گا اور گدا کہلائے گا۔ گدا بہرحال منعم کا ہم پایہ نہیں ہو سکتا۔ منعم سب کچھ لٹانے کے بعد بھی منعم ہی رہتا ہے اور گدا سب کچھ حاصل کر لینے کے بعد بھی گدائی کے رتبے سے بلند نہیں ہو سکتا۔

بندگی کی شان گدائی میں ہے۔ منعمِ حقیقی کی ہمسری کا ہلکا سا خیال بھی آنا درِاصل اس کی بارگاہ سے نیازمندی کا رشتہ قطع کر لینے کے مترادف

سے انسان فرعون کا مثیل بن جاتا ہے۔ تباہی اور بربادی اس کے گرد منڈلانے لگتی ہے اور انجام کار اس کا حشر بھی وہی ہوتا ہے جو فرعون کا ہوا انتظار ڈھیل نجات کی دلیل نہیں ہوتی۔ بلکہ ہلاکت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ فرعون نے مدتوں خدائی کے جھوٹے دعوے کیے تھے اور خدا کے بندوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ لیکن جب وقت موعود آ گیا تو کوئی بھی اسے ہلاکت سے نہ بچا سکی۔ منعم کی بارگاہ سے فیضیاب ہونے کے بعد گدا کے ذمے شکر ہوتا ہے اور شکر عافیت کی دلیل کہلاتا ہے۔ ممنون ہونے والا گدا منعم کی مزید نوازشوں کا مستحق بن کر رہتا ہے۔ اس کی طرف خود بخود دستِ کرم اٹھنے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر منعم کو گدا سے محبت ہوتی ہے جیسے آئینہ دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور سخی کے لیے گدا کی صورت آئینہ بن جاتی ہے۔ وہ اس میں اپنے سخا کے حسن کو دیکھتا ہے تو نثار ہونے لگتا ہے اس کی یہ محبت دراصل اپنی ہی ایک صفت سے محبت ہوتی ہے۔ گدا چونکہ سخی کے جذبۂ رحم و کرم کا مظہر بن کر سامنے آتا ہے۔ اسی لیے اسے محبوب نظر آنے لگتا ہے۔ جو بندے خدا تعالیٰ کی صفات کا آئینہ بن جاتے ہیں وہ نگاہِ فطرت میں اسی لیے محبوب ہوتے ہیں کہ قدرت ان میں اپنا ہی حسن و جمال دیکھتی ہے۔ اپنی ہی صفات کو آشکار پاتی ہے تو انہیں اپنے قریب

کر لیتی ہے، اپنے قرب سے نوازتی ہے۔ اپنے حسن کے آئینے کا ٹوٹنا یا
گرد آلود ہونا کسی حسین کو گوارا نہیں ہوتا۔ آئینۂ حسن کا مظہر بن جاتا ہے
تو ٹھوکروں سے محفوظ ہو جاتا ہے، گرد و غبار اس کے قریب نہیں پھٹکنے
پاتا۔ حسن کے ہاتھ خود اس کی صفائی کرتے ہیں۔ اسے گرد و غبار سے
محفوظ رکھنے کے لیے تا حدِ امکان کوششیں کی جاتی ہیں۔ بندہ بھی حسنِ
فطرت کا آئینہ بن جانے کے بعد خدا کی پناہ میں آ جاتا ہے۔ خدا
ہی اس کا محافظ و نگران ہوتا ہے اور خدا ہی اس
کی مدد کے لیے غیب سے سامان پیدا کرتا ہے۔ گدا کی فطرت کیسی ہوتی
ہے جب وہ کسی ذات کو اپنی آرزوؤں کا ملجا و ماویٰ قرار دے لیتا ہے
اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس بارگاہ سے مراد مل کر رہے گی تو وہ وہیں
ڈٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔ تاخیر اس کے عزائم میں خلل انداز نہیں ہو سکتی۔ اور نہ
وہ ان ناگوار باتوں کو خاطر میں لاتا ہے، جو انتظار کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ اس
یقین سے اس کا سینہ معمور ہوتا ہے کہ جب دروازہ کھلا، گھڑیوں
کی قیمت وصول ہو جائے گی۔ ایسے یقین کی دولت سے بہرہ ور گدا محروم نہیں
رہتے۔ سخی کو جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ طویل مدت سے در در پر
پڑا انتظار کی زحمت برداشت کر رہا ہے، تو اس کے احسانات کا
تار جھنجھنا اٹھتا ہے۔ اتنا عطا کر دیتا ہے کہ اسے تنگیٔ داماں کی شکایت ہونے

تگی ہے اس نوعیت کی بھیک کے مستحق صرف وہی گدا قرار پاتے ہیں جنہیں سخی کے کرم پر کامل اعتماد ہوتا ہے۔ تاخیر ان میں مایوسی پیدا نہیں کر سکتی جو نسبت انہیں سخی کی ذات سے قائم ہوتی ہے وہ کسی صورت میں ٹوٹنے نہیں پاتی۔ جو گدا عجز کا سرمایہ لے کر آنے کی بجائے کبر و غرور کا اظہار کرنے لگتے ہیں اور آواز میں سوز پیدا کرنے کی بجائے استحقاق جتاتے ہیں، لطف و کرم کا مورد نہیں بنتے۔ لطف و کرم تو حصہ ہی نیازمندوں کا ہے جو خود بخود ان کی جھولی میں آکر رہتا ہے۔ بارگاہِ صمدیت سے مانگنے کا طریقہ ہی یہ ہے کہ انسان کا دل اپنی بے مائیگی کے احساس سے لبریز ہو۔ اسی کو قادرِ مطلق اور نجات دہندہ سمجھے۔ جب کسی کا احساسِ عجز حد سے فزوں ہو جاتا ہے اور نظریں اسی کی بارگاہِ جمال پر مرکوز رہنے لگتی ہیں تو سوز کی تاثیر سے لبریز دل اور خشیتِ ربانی سے اشکبار آنکھوں کا عطیہ ملتا ہے، گھن گرج بارش کے آنے کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور درد کی تاثیر سے لبریز دل اور برسنے والی آنکھیں رحمتِ الٰہی کی آمد کی علامت کہلاتی ہیں۔ آنسو گرتے ہیں تو غیب سے آنسو پونچھنے والا ہاتھ بھی نمودار ہو جاتا ہے۔ مسخر دل کی کون دلجوئی کرتا ہے اور ان کے غم میں شریک ہونے کی تڑپ کس دل میں پیدا ہوتی ہے؟

محبت کے خیابان

بندہ جب مشیت۔ باآنی کے تابع ہو جاتا ہے تو یہی نہیں کہ اس کی حیات سنور جاتی ہے اور اسے امن حاصل ہو جاتا ہے بلکہ وہ اپنے لیے ذخیرۂ آخرت بھی فراہم کر لیتا ہے۔ فساد تو وہاں آکر پھوٹتا ہے جب بندہ خواہشات کا پشتارہ لے کر مشیت کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے وہ اپنا ایک ایک مطالبہ منوانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ غلام اسی کو راحت نصیب ہو سکتی ہے۔ جو آقا کی مشیت میں ڈھل جاتا ہے۔ اپنی خواہشات پر اس کی خواہشات کو مقدم جانے جو غلام آقا کو اپنی مرضی کا پابند بنانا چاہتا ہے۔ ہر مطالبہ اس سے منوانے کی کوشش کرے۔ اسے کبھی راحت نصیب نہیں ہوتی۔ راحت آقا کو اپنی مرضی کے تابع بنانے کی کوشش میں نہیں اس کے مزاج میں ڈھل جانے میں ہے۔ ایسا غلام اگر آزاد بھی ہو تو محمود بن کر رہتا ہے۔ محبوبیت اسے مل کر رہتی ہے محبوبیت نافرمانوں کو نہیں ملتی یہ اطاعت گزاروں کا حصہ ہے۔

بندہ بھی جب اپنے تمام امور خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے،

اس کی مشیت کا غلام بن جاتا ہے اور اس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا خدا کے لیے ہو جاتا ہے تو اسے بارگاہ صمدیت سے قبولیت کی سند ملتی ہے جب ربانی احکام کو اپنی عقل کی میزان میں تولنے کا خوگر ہو جاتا ہے اور اس کی مشیت میں دخل اندازی کرنے لگتا ہے تو مردود بارگاہ قرار پاتا ہے ایسے غلام کو کبھی آسودہ حال اور مطمئن نہیں دیکھا گیا جو آقا کے ہر حکم کو اپنی عقل کی میزان میں تولنے کا خوگر ہو، اطاعت کے لیے یہ شرط قرار دے کہ وہی حکم مانوں گا جو میری عقل کی میزان میں پورا اترے، میری خواہشات کے مطابق ہو، ایسے انسان کو کوئی معمولی درجہ کا انسان بھی اپنی ملازمت میں رکھنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ اختیار کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ اطاعت اور فرمانبرداری چاہتا ہے۔ کوئی با اختیار ذات اپنے ملازم کے سامنے جھکنا گوارا نہیں کرتی تو اس قادر و قیوم ذات سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے نظام میں بندوں کی خواہشات کی پابند ہوگی۔ وہ تو لامحدود اختیارات کی مالک ہے، سمیع اور بصیر ہے۔ بے نیاز ہے اسے منانے کی تو ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ اس کی کبریائی کو تسلیم کر لیا جائے۔ غیر مشروط طور پر اس کی اطاعت قبول کر لی جائے۔ ایاز، محمود کے ہاتھ سے کڑوا خربوزہ لے کر بھی کھا تا ہے اور اس کی کڑواہٹ کی شکایت کرنے کی بجائے یہ کہہ کر فرحت و شادمانی کا اظہار کرنے لگتا ہے کہ جس ہاتھ سے میٹھی میٹھی چیزیں

ملی ہیں جن ہاتھوں نے شانہ بن کر ہاں کی طرح میری زلفوں کو سنوارا ہے سی
ہاتھ سے اگر ایک کڑوی چیز مل گئی تو شکایت کیسی ؟ تو اس کی یہی ادا اسے
قرب کے نئے مرتبے پر فائز کر دیتی ہے ۔

مراتب کی بلندی اہلِ محبت کا حصہ ہے۔ شکر گذار بندوں کو اس
نعمت سے نوازا جاتا ہے۔ عقل کے اسلحہ خانہ سے نئے نئے ہتھیار نکال
کر الجھنے والوں اور دلیل کے چکروں میں پڑنے والوں کو قرب کی منزل کے
قریب کون پھٹکنے دیتا ہے ؟ قرب کی منزل کے راز و نیاز اور ہم آغوشی
کی لذتیں تو رضا کے بندوں کو ملتی ہیں ۔

محبت دوست کے ہاتھ سے کڑوی چیز لے کر بھی خوش ہو جاتی ہے
اور ہوس نعمت پانے کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوتی ۔ اسے نعمت میں بھی خرابیاں
نظر آتی ہیں ۔ کبھی اس کی کمی کی شکایت کرتی ہے اور کبھی دوسروں کو دیکھ کر بے قرار
اضطراب کا اظہار کرنے لگتی ہے کہ مجھے ان پر فائق کیوں نہیں کیا گیا ہوس
کے دل میں چونکہ اپنی برتری کا احساس ہوتا ہے، اس لیے وہ ہر حال میں
دوسروں پر فائق ہونا چاہتی ہے اور محبت چونکہ بے اختیار ہوتی ہے بے
اختیاری اس کی فطرت میں داخل ہے، اپنے اختیارات کی نفی کرنے
کے بعد وہ محبوب کے اختیارات کی بلندی تسلیم کرانے کی تگ و دو میں مصروف
رہتی ہے، اس لیے محبوب کی بارگاہ میں اسے اپنا کوئی حق نظر نہیں آتا ہر

عنوان وہ محبوب ہی کو بلند و بالا دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کے اختیارات دیکھ کر اسے مسرت ہوتی ہے اس لیے وہ ہر حال میں راضی رہتی ہے۔ عقل اپنے اختیارات منوا کر خوش ہوتی ہے اور محبت بے اختیار بن کر معراجِ کمال حاصل کرتی ہے۔ ایک کی ساری تگ و دو خود کو منوانے کے لیے ہوتی ہے اور اس میں وہ اپنی عمر صرف کر دیتی ہے اور ایک محبوب کی بارگاہ میں حیات کا سرمایہ لے کر اس لیے حاضر ہوتی ہے کہ اس کا بول بالا ہو۔

خُدا کا قانون

گلی کوچوں میں بکھری ہوئی غلاظتیں کسی معاشرے کی صحت مندی کی علامت نہیں ہوتیں۔ محکمہ حفظانِ صحت اگر فرض شناس ہو تو پورے شہر کی فضا صاف ستھری نظر آتی ہے۔ نہ ہی کہیں غلاظت دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی عفونت سے دل و دماغ پریشان ہوتے ہیں۔ کھلی فضا میں اسی وقت دم گھٹتا ہے جب چاروں طرف غلاظتوں کے انبار پڑے ہوں۔ فسق و فجور کی گرم بازاری، گناہوں کی کثرت اور معاصی اور طغیان کی فراوانی کسی نظامِ کار کی بہتری کا ثبوت نہیں ہوتی۔ باطل کو اسی وقت فروغ حاصل ہوتا ہے جب حق کے ارتقاء پذیر ہونے کے تمام راستے مسدود ہو

جائیں۔ جب نظامِ کار خدا تعالیٰ کے نیک بندوں کے ہاتھ میں ہو جن کے دل حق پرستی کے جذبات سے مملو ہوں تو حق کو فروغ حاصل ہو کر رہتا ہے باطل کو سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔

آفتاب کا وجود ظلمتوں کے لیے پیامِ موت کی حیثیت رکھتا ہے یہ ناممکن ہے کہ آفتاب درخشاں اور تاباں ہو۔ اور ظلمتیں پھیل رہی ہوں چاروں طرف ان کی کارفرمائی ہو اور تاریکیوں میں کچھ دکھائی نہ دے۔ آفتاب کا وجود تو پوری کائنات کے لیے نور کا پیام ثابت ہوتا ہے اس کی شعاعیں کسی محدود جائے تک محدود نہیں رہتیں۔ ہر ذرۂ ممکنات اس کی تابانیوں سے مستنیر نظر آتا ہے۔ بھلائی اور نیکی کا وجود بھی آفتاب کی حیثیت رکھتا ہے نیکی جسے کی قوت جب بھی خدا تعالیٰ کے نیک بندوں کے ہاتھ میں آئی ہے۔ پوری کائنات نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ زخمی دلوں نے راحت محسوس کی ہے۔ بے سہاروں کو سہارا ملا ہے۔ بے یاروں کی فریاد سنی گئی ہے۔ اور کسی مظلوم کے آنسو بیکار نہیں گئے۔ انہیں ان کی قیمت ملی ہے انسانیت کے چہرے سے شرافت کی نقاب صرف اسی وقت نوچی گئی ہے جب مظلوموں کی فریاد سننے والا کوئی نہیں رہا حق پرستی کے جذبات کی جگہ باطل پرستی نے لے لی ہے۔

ظلم وجور اور شقاوت نے جب بھی کسی حجاج بن یوسف کا روپ

دھار کر علم اٹھایا ہے، تو اس کے عہد کے حسن بصریؒ کا دل دونیم ہوا ہے۔ اس کی مظلومیت پہ قدسیوں نے آنسو بہائے ہیں۔ کروبین اس کے غم میں سوگوار ہوئے ہیں۔ اور دلِ یزداں بسمل کی طرح تڑپا ہے۔ اپنوں کے غم میں کون پریشان نہیں ہوتا۔ اور اپنوں کی موت پر کس کے آنسو نہیں بہتے؟ انسان جب مظلوم اور مقہور ہوتا ہے، زخموں سے نڈھال ہو کر دو قدم چلنے کی سکت سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور اس پر زندگی کی راہیں مسدود نظر آنے لگتی ہیں۔ اسے ظلمتوں میں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ تو اس کا شکستہ دل تجلی گاہ دوست بن جاتا ہے۔ تسکین بن کر دوست خود سہارا دینے آتا ہے۔ اس وقت اس کے آنسوؤں میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ اس کی کراہیں عرشِ معلےٰ کا دل ہلا دیتی ہیں۔ اور اس کے زخمی دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی فریاد سننے کے لیے اجابت عرشِ معلےٰ سے دوڑتی ہوئی آ کر اس سے بغل گیر ہو جاتی ہے۔ ایسے انسانوں سے جنگ خدا سے جنگ ہوتی ہے۔ ایسوں کی مخالفت خدا کی مخالفت کہلاتی ہے۔

حسن بصریؒ کے چہرے پر ڈھلکتے ہوئے آنسو، حجاج کی تباہی کا پیش خیمہ تھے۔ اور سجادؒ کے پاؤں کی زنجیر اور گلے کے طوق کا ہر حلقہ فریاد و فغاں کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ فریاد و فغاں کیسے رائیگاں جاتی؟ اپنا اثر دکھا کر رہی۔

حق کو جو لوگ قوت کے ذریعے دبانے کا عزم رکھتے ہیں وہ
اگر ہنگامی طور پر کامیاب بھی ہو جائیں تو یہ کامیابیاں ہمیشہ ان کا ساتھ
نہیں دیتیں، حق کو پھر غلبہ نصیب ہوتا ہے اور باطل مٹ کر رہتا ہے
یہ قانونِ قدرت ہے۔ اور اس میں ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں۔

گدا اور غنی

بارانِ رحمت کا نزول مردہ زمین کو زندگی عطا کرتا ہے۔ اور یہ سلسلہ
باغ و بوستان تک ہی محدود نہیں رہتا، ہر خطۂ زمین کو نئی زندگی ملتی ہے
خواہ وہ بنجر ہی کیوں نہ ہو، بنجر زمین میں بھی روئیدگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔
خدا تعالیٰ کے نیک اور پاک انسانوں کی زندگی بھی بارانِ رحمت
کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا سحابِ کرم جب برستا ہے تو دشت و جبل کو
سیراب کرتا ہے۔ ہر روح میں نیکی کی طلب پیدا ہونے لگتی ہے۔ اور بدی
سے خود بخود دل نفور ہونے لگتے ہیں۔ چمنستانوں اور خیابانوں کی دلکشی اس
امر کا ثبوت ہوتی ہے کہ ادھر سے کاروانِ بہار گذرا ہے۔ یہاں حسلِ گریہ
کرم برسا ہے۔ بنجر زمین پہ بھی روئیدگی کے آثار بارانِ رحمت کا ثبوت
ہوتے ہیں۔ غرض رحمت کی خاصیت ہی یہ ہے کہ اس کے بادل جب

بھی برستے ہیں کسی کو محروم نہیں رکھتے۔ یہ الگ بات ہے کہ بہار ہیں کسی کا
دامن پھولوں سے بھر جاتا ہے۔ اور کسی کے حصے میں چند تنکے آتے ہیں۔
یہ اپنی اپنی استعداد ہے۔ اپنی اپنی قابلیت ہے کسی کے مقدر میں بہار کی
شادابیاں ہوتی ہیں۔ اور کسی کے مقدر میں چند تنکے۔ فطرت کا فیضان
ازل سے جاری ہے۔ اور ابد تک جاری رہے گا۔ آسمان سے گرنے
والی ہر بوند کے مقدر میں موتی بننا نہیں ہوتا۔ موتی وہی بوند بنتی ہے جس
کے لیے صدف کا منہ کھلا ہو۔ سیپ اسے پیٹ میں لے کر سمندر کی گہرائی
میں اتر جائے۔ مدتوں کی قید بوند کو موتی کی صورت میں ڈھال دیتی ہے
اسے چمک دمک عطا کرتی ہے۔ اور اسی کو سرفرازیاں ملتی ہیں۔ شاہوں
کے تاج کی زینت اسی کو بننا نصیب ہوتا ہے حسینوں کے گلے میں آویزاں ہونے
کی سعادت اسی کے حصے میں آتی ہے۔ بادلوں میں نہ ہی پھول کھلتے ہیں
اور نہ ہی بہاریں مسکراتی ہیں۔ وہاں تو صرف برسنے والی بجلیاں ہوتی
ہیں۔ بہاریں شادابیاں رنگینیاں و رعنائیاں صرف زمین کا حصہ ہیں۔
یہ اسی بوند کو ملتی ہیں جو بلندیوں سے اتر کر زمین کے پیٹ میں پہنچ جاتی ہے
زمین سے پھوٹ کر نکلتی ہے تو گل و گلزار کہلاتی ہے۔ سیپ کے پیٹ
سے باہر آتی ہے تو اسے آبدار موتی کہا جاتا ہے۔ فیضان یہ سب باران
رحمت ہی کا ہوتا ہے۔ نام جدا جدا ہیں۔ ہر ہر رنگ میں بھی باران رحمت

سے اکتسابِ فیض کرے، اسے فیض پہنچتا ہے۔ اور اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ بارانِ رحمت کے نزول کے وقت کوئی سیپ منہ نہ کھولے تو وہ موتی کو کیا آغوش میں لے گی؟ بوند سیپ کے پیٹ میں اترنا پسند نہ کرے تو اسے کیا چمک دمک عطا ہو گی؟ جس کا جتنا ظرف ہے، وہ رحمت سے مستفیض ہوتا ہے۔ فطرت بخیل نہیں۔ رحمت کا خاصہ کشادہ ظرفی ہے، نوازنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ بشرطیکہ کوئی استفادے کے لیے تیار ہو، رحمت کے بادلوں کو منڈلاتا دیکھے تو دامن پھیلا دے۔ دامن تو خوب سے لبریز نہ ہو گا، تو پھول ضرور عطا ہوں گے۔ عطا و بخشش کرنے والی ذات کسی کو محروم دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ عطا وہیں ہوتی ہے جہاں غنا ہو، اور ہر غنی ذات میں بے نیازی بھی ہوتی ہے۔ اسے اپنی طلب کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ پابندی محتاج کا خاصہ ہے۔ غنی میں پابندی نہیں ہوتی۔ وہاں تو سراسر غنا ہی غنا ہوتا ہے۔ سب بے نیازی ہی بے نیازی ہوتی ہے۔ اس کے سامنے تو دامن پھیلانا ہی پڑتا ہے۔ اپنی احتیاج کا اظہار کرنا ہی پڑتا ہے۔

دعا بھی اعترافِ عبودیت کی ایک صورت ہے۔ اس سے احتیاج کا اظہار ہوتا ہے۔ اپنی محتاجی ظاہر ہوتی ہے۔ اسی لیے اعترافِ بندگی کے لیے دعا ضروری ہے۔ یہ اعترافِ حقیقی کامل صورت میں ہو گا تو بندہ

کا مستحق قرار پائے گا۔ گدا کی فطرت کمینی ہوتی ہے، وہ سخی کی بے نیازی سے مایوس نہیں ہوتا۔ خوئے گدائی ترک نہیں کرتا اور انجام کار مراد کو پہنچتا ہے۔ خوئے گدائی ہی اس کی کامیابیوں کی ضامن ہوتی ہے۔

جزا اور سزا

جو لوگ سفر اختیار کرنے سے پہلے ضروریاتِ زندگی کا سامان فراہم کر لیتے ہیں ان کا سفر آسانی سے کٹ جاتا ہے۔ راہ کی مشکلات انہیں پریشان کرتی ہیں، جو زادِ سفر سے بے نیاز ہو کر گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں، نہ ہی راہ کی مشکلات کا اندازہ لگا کر سامان فراہم کرتے ہیں اور نہ ہی منزل کا تعین کرنے میں بصیرت سے کام لیتے ہیں۔ منزل پر پہنچنے کے لیے سمتِ سفر کا تعین بھی ضروری ہوتا ہے اور یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ سفر کا آغاز مناسب وقت پر کیا جائے۔ صبح سویرے سفر اختیار کرنے والے تمازتِ آفتاب سے بچ جاتے ہیں۔ دھوپ کی شدت انہیں پریشان نہیں کرتی اور منزل پر پہنچنے کے بعد ان پر درماندگی طاری نہیں ہوتی۔ جو مسافر گو منزل [illegible] سحر کن مناظر کی دلفریبیوں سے لطف اندوز ہونے سے محروم کر دیتی ہے۔ عشق کی منزل کا مسافر بھی صبح

سفر اختیار کر لیتا ہے۔ تو اس کا سفر آسان ہو جاتا ہے، تیز دھوپ اور لو کے تھپیڑوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ سفر جس نوعیت کا ہو، سامان بھی اسی کی نسبت سے درکار ہوتا ہے۔ صحراؤں اور ریگستانوں میں سفر کرنے والے مسافر کا رخت سفر شاداب وادیوں اور بہار آفرین آبادیوں میں سفر کرنے والے انسان کے رخت سفر سے مختلف ہوتا ہے۔ صحرا کی ضرورتیں آبادیوں کی ضرورتوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ اسی طرح عقبیٰ کی منزل کے مسافر کا رخت سفر دنیا کے مسافر کے رخت سفر سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ دنیا کے مسافر کو دنیوی ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں مال و دولت اور ساز و سامان کام دیتے ہیں اور آخرت کی منزل پر پہنچنے کے لیے اعمال صالح کی ضرورت ہے۔ نزع میں بھی اعمال تسکین بخشتے ہیں۔ قبر میں بھی ان کی روشنی قبر کے اندھیروں کو نور میں تبدیل کر دیتی ہے اور حشر کے میدان میں بھی ان کی موجودگی رحمتوں اور سرفرازیوں کا موجب ثابت ہوگی۔ آفتاب قیامت اپنی تمام تر شرر باریوں کے باوجود ان میں اعمال صالحہ کا اثاثہ رکھنے والوں کو پریشان نہیں کر سکتا یہ لوگ رحمت کے سایہ میں ہوں گے۔ رحمت ہی ان کی انیس ہوگی اور رحمت ہی مونس و مسافر۔ دنیا کا مال و متاع صرف دنیا کی راہوں میں کام آسکتا ہے لیکن آخرت کے لیے جو اثاثہ فراہم کیا جاتا ہے وہ دنیا کے سفر کو بھی آسان بنا دیتا ہے اور عقبیٰ میں بھی راحتوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

عقبیٰ کی تسکین کیا ہے؟ انسان کے اعمال صالحہ جو لوگ
خدا کی مشیت کے تابع رہ کر سرانجام دیتے ہیں عمل کوئی بھی
ضائع نہیں جاتا خواہ نیک ہو یا بد، اچھا ہو یا برا، خیر ہو یا شر،
ثواب ہو یا گناہ، رنج اور راحت انہی اعمال کے مختلف مظاہر
ہیں، مختلف صورتیں ہیں اور یہی صورتیں انسان کو پیش آتی
رہتی ہیں۔ یہاں بھی اور وہاں بھی۔ دنیا میں بھی اور
عقبیٰ میں بھی، ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی
غیب و شہود کی دنیا پر فرماں روائی کرنے والی قادر و قیوم ذات دونوں
جہان میں انسان کو اس کے اعمال کی جزا دیتی ہے۔ جیسے اعمال
ہوں گے ویسی جزا متشکل ہو کر سامنے آئے گی۔ نیک انسانوں
کے اعمال جہنم کے شعلے بن کر ان کے جسموں کو نہیں لپیٹیں
گے اور بدوں کے اعمال جنت کی شادابیوں کی صورت
اختیار نہیں کر سکتے۔ سامنے وہی آئے گا جو کسب کیا ہوگا
اور جو اثاثہ فراہم کرنے میں زندگی صرف کی ہوگی۔

رضا کی وادی

بعض گناہ قربِ خداوندی کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور بعض نیکیاں انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہیں جس گناہ کے بعد انسان میں عجز پیدا ہو اور اس کے احساس کی تپش، ندامت کا آنسو بن کر آنکھوں سے چھلک پڑے اور بندے کو اپنے مولا کی طرف رجوع کر دے وہ اس نیکی سے افضل ہوتا ہے جو بندے میں کبر، غرور پیدا کرنے کا موجب ثابت ہو۔ بارگاہِ حق میں تقرب کا درجہ حاصل کرنے والی چیز کبر و غرور نہیں بلکہ بندگی کا وہ حسن ہے جو تمام تر خوبصورتی و رنگینی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

کوئی چیز خدا نے اس کائنات میں عبث اور بے فائدہ پیدا نہیں کی حتیٰ کہ [illegible]

اسی نسبت سے اس کے سامنے آیا ہے۔ ہمارے حضور چونکہ سید الانبیا تھے، اسی لیے حضور کو باطل کی عظیم قوتوں سے دوچار ہونا پڑا چنانچہ حضور خود فرماتے ہیں کہ جس قدر میں ستایا گیا ہوں کوئی نبی نہیں ستایا گیا۔ حضور کی اُمت میں سے جو لوگ عظیم انسان ہوئے ہیں، انہیں باطل کی عظیم قوتوں سے ٹکرانا پڑا ہے اور اسی طرح ان کی عظمتیں آشکار ہوئی ہیں۔ ان کی صلاحیتیں بروئے کار آئی ہیں ورنہ زمانے [illegible] کی عظمتوں کا لوہا مانا ہے

جو انسان خدا تعالیٰ کے مقرب اور پسندیدہ بننے کی کوشش کرتا ہے [illegible]

حادثہ واصل منزل سے کر دے۔ ایسا مسافر نہ منزل کی حقیقی راحتوں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے نہ ہی اس کی نگاہ میں ان راحتوں کی کوئی قدر و قیمت ہوتی ہے۔

وہ انسان خدا تعالیٰ کی رضا کے مفہوم کو کیا سمجھ سکتا ہے جس کے بدن پر کبھی کوئی خراش نہ آئی ہو جس نے خدا کے لیے احساسات کی قربانی نہ دی ہو اور اس کی آرزوئیں اور تمنائیں پامال نہ ہوئی ہوں۔ جذبات اور احساسات کی قربانی کے بعد ہی انسان پر رضا کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔ رضا کی منزل کا حسن بے نقاب ہو کر اس کے مردہ دل کو نئی زندگی عطا کرتا ہے۔

دِل کی زندگی

دل کی بیداری زندگی ہے اور غفلت موت۔ دل کی بیداری سے زندگی ملتی ہے۔ غافل انسان نہ خود زندگی کا لطف اٹھا سکتا ہے اور نہ دوسروں کو زندگی عطا کر سکتا ہے۔

بیداری کی دنیا اپنے نفع اور نقصان کا احساس بھی ترک کر دیتی ہے اور دوسروں کی بھلائی سے بھی چشم پوشی ممکن نہیں ہوتی۔ رحمت ہی رحمت

تک سرسبز و شاداب رہتا ہے جب تک اس کی جڑیں زمین میں پیوست رہتی ہیں۔ زمین ہی سے اس کی نمود ہوتی ہے۔ زمین ہی سے نکل کر وہ یہ بہار دکھاتا ہے۔ پھلوں پھولوں، شاخوں اور پتوں کا مالک بنتا ہے۔ حیات ملنے کے بعد بھی وہ زمین کی احتیاج سے بے نیاز نہیں ہو جاتا اپنی اصل سے کٹ کر کوئی چیز زندہ نہیں رہتی۔ انسان بھی ذات یزداں سے پھوٹ کر نکلنے والی تجلی کا دوسرا نام ہے۔ اس کی اصل سرمدی وجود ہے۔ یہ اسی ذات کا فیضان ہے جسے فنا نہیں۔ اس کی حیات بھی اسی وقت تک بہار آفریں رہتی ہے جب تک اس کا رشتہ اپنی اصل سے قائم رہتا ہے۔ نفس کی آمد و شد کا نام زندگی نہیں۔ اپنی اصل سے واصل ہونے کے لیے جو زندگی درکار ہوتی ہے وہ شعور ہی کی زندگی ہے جس میں انسان پر غفلت طاری نہ ہو۔ وجدان و شعور زندہ ہوں۔ ورنہ کھاتے پیتے تو کافر بھی ہیں۔ انہیں چونکہ دل کی بیداری نصیب نہیں ہوتی اس لیے خداوند نے انہیں مردہ کہا ہے۔ مردہ حیات کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوتا حیات کی حقیقتوں کو سمجھنا اور ان سے کیف گیر ہونا زندگی کا فعل ہے۔ زندگی عطا کرنے کے بعد خدا چھینتا نہیں۔ یہ انسان کے اپنے افعال ہیں جو اسے زندوں کی صف سے نکال کر مردہ لاشوں میں لا ڈالتے ہیں۔ حیات سے محروم ہونے کے بعد انسان احساس کی دولت سے

محروم ہو جاتا ہے۔ احساس زندگی کی علامت ہوتا ہے۔ انسانی حیات بھی جب دل کی زندگی سے محروم ہو جاتی ہے تو وہ نہ خیر کو پہچانتی ہے نہ شر کو۔ گناہ و ثواب اس کے نزدیک مساوی ہو جاتے ہیں۔ جائز و ناجائز کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ بلکہ جب انسان کا رجحان طغیان و سرکشی کی طرف بڑھ جاتا ہے تو اسے طغیان و سرکشی ہی میں مزا آنے لگتا ہے۔ خیر کے تمام دروازے اس پر بند ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال اس مریض کی ہو جاتی ہے جس کے جسم کے فاسد مادے نے اس کی تمام فطری صلاحیتوں کو بیکار کر دیا ہو۔ غذا کے ذائقے سے بھی وہ محروم ہو اور حیات کی وہ لذتیں بھی اسے نصیب نہ ہوں جو تندرست اور توانا جسم کی علامت ہوتی ہیں۔

جسم کی سلامتی غذا کی صحت پر موقوف ہے اور دل کی سلامتی کا دار و مدار روحانی غذا پر ہے۔ یہ غذا خدا کا ذکر ہے۔ خدا کی یاد ہے۔ وہ اس کے نام کی حلاوت و لذت ہے جو زبان پر آ جائے تو دل کی لذتوں اور روح کی سرشاریوں سے بھر دیتا ہے۔ تعلق اور روحانی رابطے کا خاصہ ہی یہی ہوتا ہے۔ روحانی رابطہ جس سے بھی قائم ہو گا اس کا نام مستی عطا کرے گا۔ ماں کے دل کو مستیوں اور سرشاریوں سے بھر دینے کے لیے بچے کا نام ہی کافی ہوتا ہے۔ ادھر بچے کا نام زبان پر آیا اور ادھر ماں کی روح مستیوں میں جھومنے لگی۔ سرشاریاں خون کی سرخی بن کر چہرے پر آشکارا ہونے لگیں۔ اور جسمانی

نئی کروٹیں لینے لگا۔ احساس کی یہ کروٹیں چہرے کی سرخی کی رعنائیاں اور جذبات کی بوقلمونی اس رشتۂ محبت کا نتیجہ ہوتی ہے جو ماں اور بچے کے درمیان قائم ہوتا ہے۔ بچہ غافل بن کر اپنے فرائضِ حیات کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اپنے لیے خیر سمیٹنے کی بجائے شر کا سامان فراہم کرنے لگتا ہے۔ تو ماں کی مامتا مجسم دعا بن کر اس کی بیداری کے لیے آرزومند رہنے لگتی ہے۔ اس کی شفقت و رحمت بچے کو ہلاکتوں تک نہیں دیکھ سکتی۔ ہر محبت اپنے محبوب کی عافیت میں دیکھ کر اسے چین آتا ہے۔ بچہ جب گمراہیوں کے بعد گھر لوٹتا ہے تو اس کی آغوش رحمت کھلی پاتا ہے۔

عبد اور معبود

جو شخص اپنے رب سے بھلائی کا امیدوار ہو اسے ان لوگوں سے بہتر سلوک کرنا چاہیئے جن پر اسے اختیار دیا گیا ہو۔ دوسروں پر سختی کرنے والے، اور ان کی معمولی غلطیوں پر برہم ہو کر انہیں عذاب میں مبتلا کر دینے والے خدا تعالیٰ کی رحمتوں کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ رحمتیں ان کا ساتھ دیتی ہیں جن کے دل رحم و کرم کے جذبات سے معمور ہوں۔ جو دوسروں کے عیوب دیکھ کر پردہ پوشی کی کوشش کریں، نہ کہ

دستوں کو مصائب و آلام میں گھرا ہوا دیکھ کر ان کا سہارا بنیں، انتقام لینے کی بجائے عفو و کرم کے خوگر ہوں۔ پردہ دری کی بجائے پردہ پوشی کو اپنا شعار بنا چکے ہوں، معصیت کار کو دیکھ کر اس کی معصیت کاری کا ڈھنڈورا نہ پیٹتے پھریں، بلکہ اس کی ذلت سے خوش ہونے کی بجائے اسے اس ذلت سے بچانے کی کوشش کریں۔ دانش مند کو مریض سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ وہ اسے ہمدردی کا مستحق سمجھ کر علاج کی طرف توجہ دیتا ہے۔ قابلِ نفرت چیز گناہ گار نہیں، گناہ ہے، جس سے گناہ گار کو بچانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ گناہ گار کو گناہ سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنے مولا کے اعتماد کو جیت لیتے ہیں۔ کسی فن کار کے آلودگیوں سے ملوث نقش کو پاک صاف کرنے کے جذبات سے معمورانسان فن کار کی نگاہوں میں عزیز ہو جاتا ہے۔ گرد و غبار سے نفرت کرنے کی بجائے اگر کوئی تصویر ہی سے نفرت کرنے لگے کہ اس پر گرد کیوں پڑی ہے، اور اسے توڑ دینے کی کوشش میں مصروف نظر آنے لگے، تو مصوّر اسے رحم و کرم کا مستحق نہیں سمجھے گا۔ ہر مصوّر کو اپنی تصویر پیاری ہوتی ہے۔ ہر نقاش کو اپنا نقش عزیز ہوتا ہے، اور وہ کسی حال میں بھی اس کی توہین برداشت نہیں کرتا۔ نقش کی توہین نقاش کی توہین ہوتی ہے۔ تصویر کا دشمن مصوّر کا دشمن کہلاتا ہے۔ بچہ بھی ماں باپ کی تخلیق ہوتا ہے سامنے قتل کیوں

میں اُٹھا دیکھ کر کس کا دل کڑھنے لگے اور وہ اسے سنوارنے کی کوشش میں مصروف ہو جائے۔ اسے اعلیٰ لباس پہنا دے اس کی زلفیں سنوار دے اور اسے پاک و پاکیزہ بنا دے تو بچے کے ماں باپ کے اعتماد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جیت لیتا ہے۔ پھر اس کے اور بچے کے ماں باپ کے درمیان تفریق نہیں ہو سکتی۔ تخلیق کے ذریعے خالق کا جو قرب حاصل ہوتا ہے۔ وہ دائمی ہوتا ہے، وہ کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتا۔ محکم رشتے کے ذریعے حاصل کیا گیا تعلق بھی مضبوط اور محکم ہوتا ہے۔

عبد اور معبود کا رشتہ بھی بڑا مضبوط اور محکم رشتہ ہے۔ بندہ اپنے مولیٰ کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ اس کی تخلیق ہے۔ اس تصویر کو اس نے دل سے بنایا ہے، اس لیے نہیں کہ یہ ذلیل ہو۔ دنیا کی نگاہوں میں بے حقیقت قرار پائے اور اپنے مالک کی رسوائی کا موجب بنے۔ اس کی عظمتیں جس قدر آشکارا ہوں گی۔ صانع کی عظمت و قدرت اسی قدر ظاہر ہو گی۔ ہر انسان کو گناہ سے بچانا اور اس کی عظمتوں کے تحفظ کے لیے کوشاں رہنا انسان کا اولین فرض ہونا چاہیئے۔ اخلاق و اعمال کی اصلاح طنز و تعریض کے ذریعے نہیں ہو سکتی اس کے لیے مجسمِ خلق بننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس راہ میں ایثار کام دیتا ہے۔ خلق و ایثار سے محروم انسان دوسروں کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ اصلاح

کا جذبہ رکھتا بھی ہے۔ تو وہ مفید ثابت ہونے کی بجائے مضر ثابت ہوتا ہے۔ انبیاؑ اور صلحائے کے اصلاحی اقدامات اسی لیے مفید ثابت ہوئے ہیں کہ ان کے دل خیر کے جذبات سے معمور تھے، اور ان کی خطابت کی شراب بے کوئی تلخی نہ تھی جسے پیتے ہی رگ وریشے میں نئی زندگی دوڑنے لگتی تھی۔ اور انسان کو اپنی ذات کا عرفان ہونے ساتھ ساتھ ذاتِ باری کا عرفان بھی ہونے لگتا تھا خطابت کی وہی شراب انسان کی روح کو نئی لذتیں عطا کر سکتی ہے جو ایثار و خلوص کی بھٹی میں کشید کی گئی ہو اور محبت کے پیمانوں میں بھر کر پیش کی جائے۔ نفرت کے خم خانوں سے لائی گئی صہبا خواہ کتنے بھی اچھے پیمانوں میں بھر کر پیش کی جائے، وہ لذت و کیفیت سے محروم ہوتی ہے اور وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی جو مخلصانہ جذبات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

دل کے معاملات

زندگی جو نفس کی تند و شدت عبارت ہے یہ نہ مال و دولت سے سکون پذیر ہوتی ہے اور نہ ہی تاج شہی پہن کر انسان مسرور و مطمئن ہو سکتا ہے۔ قلبی اطمینان خاص عطیہ ربانی ہے جو صرف انہی لوگوں کو ملتا ہے

جنہیں رحمت خداوندی نوازشات کے لیے چن لیتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام موسلا دھار بارش میں سفر کر رہے تھے۔ بارش سے بچنے کے لیے ایک درخت کی اوٹ میں کھڑے ہوئے تو ان کی نظر ایک لومڑی پر پڑی جو دوڑتی ہوئی آئی۔ وہ اپنے بل میں گھس گئی۔ روح اللہ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ لومڑی کے لیے تو ایک بل موجود ہے جہاں وہ پناہ لے سکتی ہے لیکن میرے لیے جھونپڑی بھی نہیں۔ اس خیال کے آتے ہی روح اللہ پر وحی نازل ہوئی کہ آپ بھی لومڑیوں کی طرح کی آرزو کرنے لگے تو جنت کے تختوں کو کون قبول کرے گا؟ ہمارے دوستوں کی آرزوؤں اور لومڑیوں کی آرزوؤں میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے۔ انسان مال و دولت اور جاہ و حشمت سے بڑا نہیں بنتا۔ اس کی عظمت کا معیار وہ آرزوئیں ہوتی ہیں جو اسے حیوانوں کے زمرے سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرتی ہیں۔ زندگی تمام تر آرزوؤں و تمناؤں کا مجموعہ ہے۔ اگر یہ مادی دنیا ہی بن کر رہ جائے اور زندگی اسی کے گرد گھومنے لگے تو انسان کا ان دیکھی دنیا سے رشتہ استوار نہیں ہو سکتا۔ جب جہان کا کبھی دل میں خیال پیدا نہ ہو تو اس سے وصول کی تمنا ہو؟ اس کی واردات و کیفیات سے دل کیسے لذت یاب ہو سکتا ہے؟ جو دنیا دل میں

بسی ہو گی جو جہان دل میں آباد ہو گا۔ اسی کی لذتیں وارد ہوں گی، اسی کی کیفیات مزا دیں گی۔ ظاہری جہان ہی مزا نہیں دیتا، باطنی جہان بھی مست و سرشار کر دیتا ہے۔ کسی قیدی کو اسارت کی زندگی میں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ صبح قید سے نجات مل جائے گی تو گھر پہنچ کر حاصل ہونے والی خوشی کے تصور ہی سے اس کی رات صبح خنداں کی طرح جگمگانے لگتی ہے اور اس کے دل سے قید کی زندگی کے مصائب و آلام کا خیال مٹ جاتا ہے۔ چند یوم تک پھانسی پانے والے قیدی کو اگر انتہائی خوش و خرم بھی رکھا جائے تو اس کے دل سے موت کا خوف زائل نہیں ہوتا۔ اچھے خیال سے بھی روح کو طمانیت حاصل ہوتی ہے اور برا خیال بھی انسان کو پریشان کر دیتا ہے خواہ وہ کسی گزرے ہوئے حادثے کا خیال ہی ہو۔

وہ دل مبارک ہیں جو مصائب و آلام میں بھی اخروی زندگی میں حاصل ہونے والی رضائے دوست کی تابانیوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ رضا کے جمال پر نظر رہتی ہے تو مصائب کی شدت بھی کم ہو جاتی ہے اور روح پر ایک نشہ بھی طاری رہنے لگتا ہے۔ بعض کوچوان تانگے میں جتنے والے گھوڑے کو نشے کا عادی بنا کر تکلیف کے احساس سے بچائے رکھتے ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ نشہ اس گھوڑے کو دیا جاتا ہے جو مالک کی رضا کا آپ موجد

ک کی رضا کا تابع نہیں بنتا اس کے مقدر میں چکر ہوتے ہیں اور اس کی جھاڑو سے تواضع کی جاتی ہے۔

بندہ بھی جب خدا کی رضا کے لیے مصائب برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاتا تو اسے خانۂ قدرت سے ایک نشہ اور ایک سرشاری عطا ہوتی ہے جو اسے مصائب و آلام کی شدت محسوس نہیں ہونے دیتی۔ بلالؓ کو ایک نشہ ہی تو تھا جو دہکتے ہوئے انگاروں پر مست و سرشار بنائے ہوئے تھا۔ نشے میں تو جان بھی چلی جائے تو احساس نہیں ہوتا۔ نشہ نہ ہو تو کانٹے کی چبھن بھی محسوس ہوتی ہے اور انسان کراہنے لگتا ہے۔ روزوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار خدا سے اس نشے کی طلب بھی کرنی چاہئے جو خاصانِ بارگاہ کا حصہ ہوتا ہے۔

احساس کے کرشمے

سفر کا آغاز کرنے سے پہلے انسان کو دو کیفیتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے یا تو اس پر نشاط کا غلبہ ہو تو دل نشاط کے جذبات سے معمور اور مسرت سے لبریز ہو یا ندامت۔ اگر انسان گنہگار ہو تو قدم اٹھنے سے پہلے ماضی کی خطاؤں کی ہولناکیوں کے تصور سے انسان کے قدم

کا شیرازہ منتشر کر کے رکھ دیں گے۔ خطرے طلب کی خامی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جہاں عزم راسخ ہو خطرات راہ نہیں پا سکتے۔ بلکہ خطرات سے انسان دوچار ہوتا بھی ہے، تو ان کی ہونا کیوں کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

منزل کی طلب خام ہو، تو معمولی خطرات بھی مہیب طوفانوں کی طرح نظر آنے لگتے ہیں۔ بدر و حنین کے معرکوں میں کفار کی صفیں الٹنے والے غازیوں کو جو مشکلات درپیش تھیں، وہ ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہ رکھتی تھیں کیونکہ انہوں نے خدا کے دین کی راہ کو حصول مقاصد کا ذریعہ بنا کر قبول نہیں کیا تھا۔

شکستگی اسی وقت طاری ہوتی ہے [illegible] وقت گئے [illegible] جب انسان کی توقعات پوری نہیں ہوتیں۔ [illegible] کرتا ہے۔

[illegible]

اور سرشاریاں عطا کر رہی تھیں تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی، کہ ان کے دل و دماغ پر یہ احساس طاری تھا کہ یہ مشکلات انہیں نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے نہیں، بلکہ خدا اور رسول ؐ کی رضا جوئی کے لیے پیش آ رہی ہیں۔ مسرت کے جذبات سے دل لبریز ہو تو معمولی غم روح پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ مسرت کے جذبات غم کو اپنی کیفیت میں ڈھال لیتے ہیں۔ غم نشاط انگیز ہو جاتا ہے۔ اور اگر دل مغموم ہو، غم کی بے پناہی دل کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہو تو معمولی نشاط کے جذبات بے فائدہ اور بے عمل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مغلوب کو غالب کے مزاج میں ڈھلنا پڑتا ہے۔

غازیانِ بدر و حنین کے دل چونکہ سرمدی نشاط کے جذبات سے معمور تھے، انہیں یہ احساس [illegible] زندگی [illegible] [illegible] [illegible] جو [illegible] پیچھے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کی شدت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] زیادہ عزیز تھی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

رکا کہ انہوں نے خسارے کی راہ اختیار کی ہے۔ خسارے کا احساس ہوس میں ہوتا ہے، محبت میں نہیں۔

سود و زیاں کا احساس موجود ہو تو انسان تاجر تو کہلا سکتا ہے لیکن اسے محبت کی راہ کا مسافر نہیں کہا جا سکتا۔ ہوس میں اپنے احساسات کی رعایت برتی جاتی ہے اور محبت سراسر محبوب کی رضا کا سودا ہے۔ احساسات ہوتے ہیں تو وہ بھی محبوب کے، رضا ہوتی ہے تو وہ بھی اسی کی۔ اربابِ ہوس کے دل کی رفتار اپنے جذبات و احساسات سے قائم ہوتی ہے، اور شہیدانِ محبت کے دل کی دھڑکن محبوب کے قدموں کی آواز سے عبارت کہلاتی ہے۔ دل دھڑکتا ہے تو وہ محبوب کی آہٹ کا پیامبر بن جاتا ہے۔ آواز اگر اپنی ہو، جذبات و خیالات اپنے ہوں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ کوئی دل میں سمایا نہیں، کسی نے دل کو اپنی جلوہ گاہِ ناز کے لیے منتخب نہیں کیا۔

خالق اور تخلیق

درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے شاگرد استاد کی عظمت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ امتی نبی کی عظمتوں کا امین کہلاتا ہے اور بندہ وہ ہے جسے دیکھ کر خالق کی معرفت حاصل ہو۔

ہر تخلیق اپنے خالق کی تخلیقی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جو نقش ناتمام ہو اپنے خالق کی عظمتوں کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کی رسوائی کا موجب بن جاتا ہے۔ دنیا میں کون سا خالق ہے جو اپنی رسوائی کو پسند کرتا ہے۔ بندہ جس کی تخلیق ہی احسن تقویم میں ہوئی ہے جب اپنے مقام سے گر جاتا ہے تو یہی نہیں کہ اپنے لیے ذلتوں کے سامان فراہم کر لیتا ہے، بلکہ خالق کے لیے بھی وجہ افتخار نہیں رہتا۔ قدرت کو انہی بندوں پر ناز ہوتا ہے جو بندگی کے مفہوم کو سمجھتے ہیں اور اسی مفہوم کی جھلکیاں ان کے اعمال و کردار میں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ بندگی سے دور ہو کر ناآشنا انسان جب اپنی تخلیق کا مقصد بھول کر غلط راہ پر گامزن ہو جاتا ہے تو اسے دیکھ کر قدرت بھی شرمندہ ہوتی ہے کہ یہ میں نے کیا بنایا

سے تخلیق کو لباس عطا کیا تھا۔ غیر معمولی صلاحیتیں جن سے تخلیقی عمل کیا جاتا ہے انہیں غلط استعمال کرتا پھرے، حکومت سے اسلحہ لینے کے بعد کوئی شخص حکومت ہی کے خلاف استعمال کرنے لگے تو وہ معتوب قرار پاتا ہے۔ تمام روحانی صلاحیتیں قدرت کا عطیہ ہیں جو انسان کو حق کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے عطا کی گئی ہیں ان کے صحیح استعمال سے انسان خدا کا مقبول بن سکتا ہے اور غلط استعمال سے نہ صرف یہ کہ اس کی پوزیشن قدرت کی نگاہوں میں مخدوش ہو جاتی ہے، مگر وہ راندۂ درگاہ قرار پاتا ہے۔ محبوبیت اور مردودیت کا معیار اطاعت ہے۔ وہ بندگی ہے جو انسان میں عبدیت کی شان پیدا کر دے اور اسے ان صفات سے متصف کر دے جو خالق کی عظمتوں کا پتہ دیں۔

تصوف کے ذریعہ ہی انسان کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے لیکن بار بار شہادت پانے کا یقین رکھتا ہے جو لوگ فن کو جدا کر کے فن کار کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں فن کا صحیح عرفان حاصل نہیں ہوتا اسی لیے کہا گیا ہے کہ عرفان اصول کے ذریعہ فن ذات تک ممکن نہیں۔ اس لیے کہ صحیح قدرت کا وہ تخلیقی شاہکار ہے جس پر قدرت کو ناز ہے۔ ہر زمانہ کو ایک ایسا شاہکار دیا جاتا ہے جس میں اس کی عظمت فن پوری طرح نمایاں ہوتی ہے اور ایسا شاہکار فن پارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ جنت کی محبوبیت کی یہی وجہ ہے کہ خدا

کی ذات سے ذاتِ باری کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ معرفتِ ربانی کے
ہوتا ہے۔ معرفتِ ربانی کے حجاب در حجاب جلوے جن تک عقلِ انسانی
کی رسائی ممکن نہیں۔ جمالِ محمدی کی ایک جھلک دیکھ لینے سے نظر آ سکتے
ہیں۔ فن جب تخلیق میں پوری طرح جلوہ گر ہو جائے تو فن کار کو بے
حجاب ہونے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، وہ خود پس پردہ چلا جاتا ہے
اور فن کو آشکار کر دیتا ہے۔

> قدرت نے تجلیوں کی بارش اسی وقت تک کے لیے رکھی تھی جب تک
> قدرت کے فن کو عروجِ کمال نہ ملا تھا۔ یہ فن ذاتِ محمدی کی
> صورت میں ظاہر ہو گیا اور تخلیق کو معراجِ کمال نصیب
> ہو گئی تو فن کار کی بے حجابی کی ضرورت باقی نہ رہی۔
> تخلیق بے حجاب ہو گئی اور خالق چھپ گیا۔ کیونکہ اب
> تخلیق خالق کی معرفت کے لیے کافی تھی۔

خیر و شر

شاعرانہ زبان میں تیمور اور چنگیز کو اللہ کے نشتر کہا گیا ہے۔ لیکن اگر غور
سے دیکھا جائے تو تیمور و چنگیز ہی اللہ کے نشتر نہیں ہر وہ حادثہ جو ہمیں
جھنجھوڑنے کے لیے پیش آتا ہے۔ اللہ کے نشتر کی حیثیت رکھتا ہے۔
نشتر زنی اتنی ہی کارآمد ثابت ہو سکتی ہے جس کی رگوں میں زندگی کا
خون موجود ہو۔ مردہ جسم پر نہ ہی نشتر زنی کا اثر ہوتا ہے اور
نہ ہی اسے وہ بیماری نصیب ہو سکتی ہے۔ جو زندگی کی علامت کہلا سکتی
ہے مسلسل اور پیہم نشتر زنی سے جب خون کا ایک قطرہ بھی برآمد نہ ہو تو اس
جسم کو دفن کر دیا جاتا ہے کیونکہ مردے سے کسی خیر کی امید نہیں کی جا سکتی،
اس کی عفونت سے فضا کو مسموم ہونے سے بچانے کی کوشش کی جاتی ہے
کوئی قوم جب زندگی کی علامت سے محروم ہو جاتی ہے تو قدرت اس کی بساط لپیٹ دیتی ہے لیکن
جبکہ کسی ایسی قوم کو پایا جاتا ہے جو زندگی کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے
جب تک وہ اپنے فرائض سرانجام دیتی ہے۔ مشیت کے تابع رہ کر
زندگی کی بہار دکھاتی ہے۔ وہ ان کو اپنے انعام کی دولت سے
بہرہ ور کرتی ہے۔ جو اپنی زندگی کی راہیں کشادہ رکھتی ہیں، اسے خوب

پھیلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے جب اسے خود غرضی اور تن آسانی کے
رجحانات مغلوب کر کے بیکار بنا دیتے ہیں۔ اس کے بحرِ خودی کا پانی
خشک ہو جاتا ہے۔ اور اس کے دریا سے کسی موجِ تند جولاں کے اٹھنے
کی توقع نہیں۔ یعنی تو قدرت کو اس کی زندگی کی کوئی ضرورت محسوس
نہیں ہوتی۔ اس کا نام و نشان مٹا دیا جاتا ہے۔ اور کرۂ ارض پر اس
کی نوحہ خوانی کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ دنیا میں کیسی کیسی غالب
قومیں گزری ہیں؟ ان کے جاہ و جبروت کا کیا عالم تھا؟ دلوں پر
ان کا کیا رعب طاری تھا؟ ان کی شان و شوکت کے پرچم کو کیا کیا
عظمتیں نصیب تھیں؟ لیکن آج ڈھونڈنے سے بھی ان کا سراغ نہیں
ملتا۔ ان کے تہذیب و تمدن کے آثار و نقوش کو بھی ماہ و سال کی گردشیں
کھا گئیں۔ ان کا سارا ادبی و فکری سرمایہ انقلابِ زمانہ کی نذر ہو گیا۔ ان
کی ایسی علامت موجود نہیں جس سے ہم ان کی عظمتوں کا اندازہ لگا سکیں
جن کے نشانات موجود ہیں، وہ بھی عبرت کی تصویریں ہیں اور شاید
قدرت نے انہیں عبرت پذیری ہی کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ قوموں کے
عروج و اقبال کو چھوڑیے۔ ہماری آنکھوں نے کیسے کیسے افراد کے
عروج و اقبال کے ادوار دیکھے ہیں؟ کیسے کیسے گلنار چہرے، نیلی
آنکھوں اور صحت مند جسموں کی بہار دیکھی ہے۔ ایک دل نشیں انداز

خطاب کے مزے لوٹے ہیں۔ اور نقش و نگار تکنے والے۔ حس کی لذت کو گنگ
بیلے میں محسوس کیا ہے۔ مدتوں ہمارا وجدان جھوما ہے۔ ذوقِ سماعت نے
مستیاں لی ہیں۔ اور روح کو سرشاری نصیب ہوئی ہے۔ آج بھی ان کی
صحبتوں کی یاد کو ہم قیمتی سرمایہ جان کر سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔
اور اپنی خلوتوں میں ان یادوں کو تازہ کر کے لذت محسوس کرتے ہیں۔
زندگی کی راہوں میں ہمیں مستیاں اور سرشاریاں عطا کرنے والے ہی
نہیں ملے، کچھ خدا کے ایسے بندوں سے مڈبھیڑ ہوئی ہے جنہوں نے
حیات کا سارا مزا کرکرا کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کی یاد بھی تلخیاں تخلیق
کرتی ہے۔ اور ذوق و وجدان کو ان کے تصور ہی سے ابکائی آنے لگتی ہے۔
انسان جو بھی فریضۂ حیات سرانجام دیتا ہے، وہ عارضی اور ہنگامی نہیں
ہوتا بلکہ ایک مستقل اور پائیدار اثر رکھتا ہے۔ دلوں کو متکیف بھی کرتا ہے
اور بے مزہ بھی۔ مستیاں بھی عطا کرتا ہے اور بے کیفیوں سے بھی دوچار
کرتا ہے۔ زندگی کی راہوں میں اجالا بھی پھیلاتا ہے اور تاریکیوں
سے بھی بھر دیتا ہے۔ خیر و شر دونوں کو پھیلانا اور اپنے دامن میں سمیٹ
لینا انسان کی مقدرت میں دے دیا گیا ہے۔ وہ اپنی پسندیدہ راہ اختیار کرنے
میں آزاد اور خود مختار ہے۔

مسبب اور اسباب

یہ جو کہا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی لاٹھی بے آواز ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات چونکہ خود لطیف ہے اس لیے اسے اپنی صفات کے ظہور کے لیے خارجی اسباب و عمل کی ضرورت نہیں ہوتی لطیف کی عطا بھی لطیف ہوتی ہے خواہ وہ قہر و غضب کی صورت میں ہو یا لطف و کرم کی صورت میں۔ بسا اوقات خارجی اسباب و عمل کے فقدان کے باوجود ہمارے دل میں نشاط کا جذبہ ابھرنے لگتا ہے اور ہماری حیات کے ہر گوشے کو مسرتوں، لذتوں اور سرمستیوں سے بھر دیتا ہے۔ حالانکہ ہمارے پاس مسرت کے اسباب نہیں ہوتے، مسرت کی کوئی خارجی وجہ نظر نہیں آتی۔ اور ہم مسرور ہوتے ہیں۔ ایسے ہی غم کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی اور ہم غم کی بے پناہیوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ رنج و راحت، خوشی اور غم یہ سب اسی کی عطائیں ہیں۔ خدا تعالیٰ کی نصرت بھی بسا اوقات غیر متوقع طور پر ظہور پذیر ہونے لگتی ہے جسے دیکھ کر ہم آئینہ حیرت بن جاتے ہیں ایسے ہی اس کا قہر و غضب

بھی بسا اوقات غیر متوقع طور پر انسان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اس کی مسرتوں کا تمام تر شیرازہ منتشر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسباب و علل نہ خوشی کے نظر آتے ہیں نہ غم کے۔ رنج و راحت اور خوشی و غم کے خالق کو ان چیزوں کو ودیعت کرنے کے لیے اسباب کی احتیاج نہیں سبب خود اپنے مسبب کے تابع فرمان ہیں۔ جیسا حکم ہوتا ہے ویسی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ غم بھی کبھی نشاط انگیز بن جاتا ہے اور خوشی بھی کبھی غم کا پیغام ثابت ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو قدرت نے چشم بینا عطا کی ہے ان کی نظر بہر حال میں اسباب پر نہیں بلکہ مسبب پر رہتی ہے۔ وہ اسی سے نصرت و اعانت طلب کرتے ہیں اور اسی کو فائدہ نعمت اور خالق غم جان کر اس کی پرستش و عبادت کرتے ہیں۔

مالکؒ بن دینار جو ملت محمدیہ کے عارفین میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں اور جن کے چشمۂ عرفان سے ایک جہان سیراب ہوا ہے اپنے ابتدائی زمانۂ حیات میں صبر آزما حادثات سے دوچار رہے ہیں اپنے ایام شباب میں جبکہ وہ تحصیل علم میں مشغول تھے تو ان کا معمول تھا کہ وہ ایک رفیع الشان محل کی دیوار کے سائے میں بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ ایک روز صاحب خانہ کے گھر چوری ہو گئی۔ نقب زنی جس ذریعہ سے کی گئی تھی وہ مالکؒ بن دینار کی نشست گاہ سے

کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھی، اس لیے چوری کے الزام میں انہیں پکڑ لیا گیا۔

ایک شکستہ حال انسان جو غریب الوطنی میں تحصیلِ علم میں مشغول تھا، اس کے لیے یہ الزام کوئی معمولی دلخراش نہ تھا۔ یاس کے عالم میں اُس نے اسی ذات کو پکارا جو اس کی حافظ و نگران تھی۔ وہ شدتِ جذبات میں بلبلاتا ہوا بولا کہ "اے حی و قیوم تو نے اپنے مقدس کلام میں فرمایا ہے کہ

"گواہ جب گواہی کے لیے بلائے جائیں تو گواہی دینے سے انکار نہ کریں۔"

میں اپنی بے گناہی کی گواہی کے لیے تجھے پکار رہا ہوں۔ میری پکار سن، مالک بن دینار کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے قدرت نے غیب سے یہ اسباب پیدا کر دیئے کہ جس چور نے نقب لگائی تھی اسے جب یہ معلوم ہوا کہ میرے جرم کی پاداش میں ایک ایسے انسان کو پکڑ لیا گیا ہے جو خدا تعالیٰ کے دین کی نشر و اشاعت کے لیے اپنی تمام زندگی اور راحتوں کو قربان کر چکا ہے تو اس کے دل میں رحم کے جذبات پیدا ہو گئے اور اس نے جرم کی سزا بھگتنے کے لیے خود کو عدالت کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ خدا تعالیٰ کی نصرت تھی جو چور کی صورت میں سامنے آئی اور ان کی بے گناہی پر مہرِ تصدیق ثبت کر گئی۔

بعض لوگ جو خدا تعالیٰ کو نادیدہ ہستی جان کر اس کے احکام سے غافل

مندی کی ایک خاص وضع قائم کر لیتے ہیں وہ ان کی وضعداری کو اور زیادہ مضبوط و مستحکم بنانے کیلئے غیب سے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ اسباب کے بندے اسباب کے بندے رہ کر بھی مطمئن نہیں ہوتے اور خدا کے بندے اسباب نہ ہونے کے باوجود بھی سکون کی دولت سے بہرہ ور نظر آتے ہیں۔ سکون اسباب سے رشتہ جوڑنے میں نہیں، اسباب کے خالق کو اپنا بنانے میں ہے۔

قول اور عمل

دل میں مخلصانہ جذبات موجود ہوں تو انسان کے قول و فعل میں یکسانیت ہوتی ہے۔ زبان دل کی ترجمان بن جاتی ہے، عمل اس کی صداقت کی شہادت دیتا ہے۔ خلوص سے عاری جذبات کی پیش نہیں ہوتی، وہاں قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے اور ایسا انسان خواہ کسی بھی بارگاہ سے منسلک ہو، اسے فوز و فلاح حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اس کا یہی نفاق اسے مردودیت تک پہنچا دیتا ہے۔

مقبولیت مخلصانہ جذبات کا نتیجہ ہوتی ہے جب خود
کی تمنا ہے کہ انسان جب بھی کسی بارگاہ میں

بہتر تو یہ قرار پاتا ہے خلوص کے صادق اور کاذب ہونے کا معیار قول نہیں عمل ہے مخلصانہ جذبہ خواہ کسی بھی نوعیت کا ہو، وہ قول کی دنیا تک محدود نہیں رہ سکتا عمل کی صورت میں ظاہر ہو کر رہے گا اور اس کے اثمار اپنی شان ضرور دکھائیں گے۔

خلوص کی پہچان ہمیشہ عمل کے میدان میں ہوتی ہے۔ عمل جتنا نکھرا اور مضبوط ہوگا خلوص کو بھی اسی نسبت سے مضبوط سمجھا جائے گا دنیا میں ایسا کوئی خلوص شایان توجہ قرار نہیں پاتا جو عمل کی قوت سے محروم ہو۔ یہی انھی لوگوں کے خلوص کو سراہتا ہے اور انہیں قدر و منزلت قرآن کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو سراپا عمل تھے جنہوں نے ایثار کے نوادرات پیش کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، دنیا میں وہ فتوحات حاصل کیں جنہیں خلوص و محبت کی فتوحات کہا جا سکتا ہے۔ سخاوت اور ایثار میں یہ فرق ہے کہ سخا کے وقت انسان کو اپنی ضروریات کا خیال رہتا ہے لیکن دل میں اگر ایثار کا جذبہ پیدا ہو جائے تو انسان ذات سے بیگانہ کسی دوسری ذات کی خوشنودی کی خاطر اپنے جذبات دل پر موجزن نظر آنے لگتے ہیں۔ سخاوت عام لوگوں میں نظر آ سکتی ہے۔ لیکن ایثار خلوص کا ثمرہ ہے جو انہی لوگوں سے ظاہر ہوگا جنہیں کوئی ذات

غایت درجہ محبوب ہو اور ایسے ہی ایثار پیشہ لوگوں کو محبوبیت کا مقام مل سکتا ہے جو کسی ذات کے لیے ایثار کرنے کو عزیز جانتے ہوں۔ ایثار ہمیشہ محبوب کے سبب ہوتا ہے اور یہ انسان کو محبوب بنا کر چھوڑتا ہے۔ محبوبیت کی منزل تک پہنچنے کے سبب ایثار کی راہ سے گزرنا ناگزیر ہوتا ہے ایثار ہو تو محبوبیت مل کر رہتی ہے ایثار نہ ہو تو اس راہ میں دو قدم چلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے جو مقبول انسان بھی محبوبیت کی منزل تک پہنچے ہیں، انہوں نے یہ راہ ایثار کے ذریعے طے کی ہے۔ ایثار صرف مال و دولت خرچ کر دینے کا نام نہیں، یہاں احساسات کی بھی قربانی دینی پڑتی ہے۔ جذبات کا نذرانہ گزارنا پڑتا ہے۔ اگر اپنے احساسات اور جذبات کی پاسداری مطلوب ہو تو محبوب کی نزاکت احساس کو ملحوظ رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ایک کی طلب دوسرے کی نفی کر دیتی ہے۔ اپنے احساس
کی نزاکت ملحوظ ہو تو محبوب کی نزاکت احساس کا احترام
نہیں کیا جا سکتا، اور اگر محبوب کعبہ مقصود بن جائے
تو اپنے احساسات کی قربانی لازمی ہو جاتی ہے۔

حقیقی طالب وہی ہوتا ہے۔ منزل بھی اسی کے قدم لیتی ہے جو منزل پر اپنا سب کچھ نثار کر دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

یہ راہ حقیقی اور کاذب انسانوں میں اس درجہ فرق اور امتیاز پیدا کر دیتی ہے کہ دونوں کو پہچاننا کوئی مشکل نہیں رہتا۔ صحیح چوٹ کھا کر تلملا پڑتا ہے اور کاذب کا سارا نشہ کافور ہو جاتا ہے۔

نور اور ظلمت

کسی اندھیرے مکان میں تیز روشنی کی ضرورت ہوتی ہے ایک چھوٹے سے کمرے کو روشن کرنے کے لیے ایک چراغ کی لو بھی کافی ہو سکتی ہے شہر کی ظلمتوں کو چند مشعلوں کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے لیکن ہند و عرب بلکہ شرق و غرب اگر ظلمتوں کی لپیٹ میں آ جائے تو وہاں مشعلوں کا نور کافی نہیں ہوتا۔ وہاں آفتاب و ماہتاب کی جلوہ باریاں ہی کام دے سکتی ہیں۔

بعض حالات میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی ضو بھی منزل کے سراغ کا باعث بن جاتی ہے اور بعض اوقات آندھیوں اور طوفانوں کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں، یہاں چراغ کام نہیں دیتا ماہتاب ہی کام دے سکتا ہے جو آندھیوں اور طوفانوں کی زد سے باہر ہوتا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کے عہد میں خلقِ قرآن کا جو فتنہ اٹھا تھا اسے

حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی مصیبت کوئی بھی تنہا نہیں آتی ایک فتنہ دوسرے فتنے کو جنم دیتا ہے اور ماحول جتنا سازگار ہو یہ سلسلہ اتنا ہی وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔

حکومت کے فکری گمراہی میں مبتلا ہونے کے بعد وہ لوگ سرکاری دین کو خدا کا دین ثابت کرنے کے بلند بانگیں لڑا رہے تھے جن کا ذہن و ضمیر بکاؤ مال تھا اور جن کے دل خوفِ خدا سے بالکل خالی تھے امام احمد بن حنبلؒ کا وجود ان کی نگاہوں میں خار کی طرح کھٹکتا تھا کیونکہ احمد بن حنبلؒ ہی ان لوگوں کے دلوں کا ناسور بکھیرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے پہلو میں جو دل تھا اس میں خدا کی محبت جاگزیں ہو چکی تھی۔ نہ اقتدار انہیں ڈرا سکتا تھا نہ دنیا کی محبت اپنی طرف کھینچ سکتی تھی۔ جان کچھ ایسا ہو چکا تھا کہ دل کی دھڑکن پیہم محبوبِ حقیقی سے کہہ رہی تھی کہ۔

آئینہ نیست دل کہ دہد رو بہر کسے
ایں پارۂ عقیق بنامِ تو کندہ شد

احمد بن حنبلؒ کی تبلیغ کے جواب میں یہی نہیں کہ ان لوگوں کی آتشِ غیظ و غضب اور زیادہ بھڑکتی تھی۔ بلکہ وہ امام کو حکومت کی نگاہوں میں معتوب بنانے کے لیے اور تیزی

سے سازشوں کے جال بننے لگے۔ ہماکے معدوم ہو جانے کے باعث کوئی شخص بوم کے زیر سایہ آنا گوارا نہیں کرتا، لیکن سیاسی بوموں کی ہمیشہ یہ آرزو رہتی ہے کہ دنیا سے وہ ہما معدوم ہو جائیں کہ انہیں ملت میں غیر معمولی محبوبیت حاصل ہے چنانچہ ایسے ہی لوگوں نے خلیفہ معتصم باللہ سے کہا یہ شخص خلق قرآن کے نظریے کی مخالفت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ کا دیدار ہو گا، حالانکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ آنکھ اس غیر محدود ذات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔

اس باب میں معتصم نے جب امام حنبل رحمہ سے استفسار کیا تو آپ نے کہا کہ میرے دعوے کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ قیامت کے دن تجلی جمال یوں نظر آئے گا جیسے چودھویں کا چاند نظر آتا ہے۔

اس زمانے میں ابھی ان لوگوں کا گروہ پیدا نہ ہوا تھا جو قرآن کو کافی کہہ کر حدیث کا انکار کرتے ہیں، ورنہ معتصم اور اس کی پاسداری کے لوگ کہہ سکتے تھے کہ خدا کے دیدار کے قائل ہو تو قرآن سے دلیل لاؤ ہم حدیث کو نہیں مانتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ معتصم نے اپنے ایک عالم سے اس دلیل کا جواب طلب کیا تو اس نے کہا کہ میں جواب سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہتا ہوں، چنانچہ اپنے گرد بیٹھا

اگر اس نے جب اس مشکل کا حل معلوم کرنا چاہا تو ایک ذہین انسان بولا کہ اس میں فلاں راوی ایسا ہے جو بعض محدثین کے نزدیک غیر ثقہ ہے چنانچہ معصوم کو مجرم نکالنے والے عالم کو یہ دلیل بہت پسند آئی وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کی خوشی کا باعث یہ نہ تھا کہ اس پر حق واضح ہو گیا ہے بلکہ خوشی کی یہ وجہ تھی کہ وہ اسلام کے ایک امام کو درّوں کا مستحق ثابت کر سکتا ہے

نظامِ قدرت

قدرت کی تقسیم کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کی حکمتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ کسی کو کوئی خوبی دے دی جاتی ہے اور کسی کو کسی دوسری سے نواز دیا جاتا ہے۔ محروم کوئی بھی نہیں۔ البتہ فرق صرف یہ ہے کہ بعض کے اوصاف پر ہماری نظر نہیں پڑتی۔

مصوّر نے جن مصلحتوں کے پیشِ نظر نقاشی کی ہوتی ہے، وہ نادر ندرت و تخیل ہوتی ہیں، ہم ایسے جھگڑے میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ یوں نہیں یوں ہونا چاہیئے تھا۔ مصوّر کے فن پر اعتراض کرنے سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کی منشا و مراد کا پورا علم ہو۔ انسانی علم چونکہ ذات احدیت کے علم کے مقابلے میں نہایت قلیل ہے اس لیئے خالق کی

کسی بات پر اعتراض نہیں کرتے، خیر پہنچتی ہے تو شکر کرتے ہیں، شر سے دو چار ہونا پڑتا ہے تو پھر بھی ان کی زبان پر شکر کے کلمات ہوتے ہیں کیونکہ وہ ذات سراسر خیر ہے جو بھی اس کی طرف سے آتا ہے وہ بھلائی ہی بھلائی اور خیر ہی خیر ہوتا ہے۔

کوتاہ اندیش جو اپنی محدود فہم کی بنا پر اپنی عقل و دانش کو کل کائنات سمجھنے لگتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی حکمتوں پر اعتراض کرنے بیٹھ جاتے ہیں، حالانکہ ان کی بے بسی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بسا اوقات وہ اپنے جیسے ضعیف کمزور اور بے مایہ انسان کی حکمتوں کو سمجھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں۔ اس امر کا مشاہدہ ہمیں بالعموم اپنی روزمرہ کی زندگی میں ہوتا رہتا ہے۔

تخلیق کائنات بغیر مقصد کے نہیں، ذرہ بھی کائنات کے حسن و جمال کو فروغ بخشنے کے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی ستارہ، نجوم و کواکب کی ساری دلفریبیاں، رنگینیاں اور رعنائیاں بجا اور درست، لیکن چند ذرے سمٹ کر پہاڑ دکھنے لگتے ہیں تو ان کی تابشیں نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہیں اور شعور فطرت کی بوقلموں تصویریں دیکھ کر زبان حمد و ثنا میں مصروف ہو جاتی ہے اور دل تقدیس کے جذبات سے لبریز ہونے لگتا ہے۔ نگاہوں کو نئی لذت ملتی ہے۔

باغ کی زیب و زینت کے لیے پھول کا وجود ہی ضروری نہیں، کانٹا بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ مالی کہیں بیلی کے پھول کی کاشت کرتا ہے، کہیں گلاب اور موتیا کو پانی دیتا ہے اور کہیں خاردار جھاڑیاں نصب کر دیتا ہے۔ یہ ساری اس کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اپنے ہی ہاتھ سے بڑے کیے ہوئے پودوں کی سرسبز و شاداب شاخوں کو قینچی سے کاٹ دیتا ہے۔ چمن بندی کے لیے یہ عمل بھی ضروری ہوتا ہے۔ کسی انسان کو مالی کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہتے ہوئے نہیں دیکھا گیا کہ یہ کیا کر رہے ہو، اپنا خون پسینہ ایک کر کے پھیلانے والی شاخوں کو پروان چڑھانے کے بعد کیوں کاٹ رہے ہو؟

لیکن انسان کی بوالعجبی کا یہ عالم ہے کہ وہ اسی نوع کا کوئی عمل قدرت کی طرف سے دیکھتا ہے تو اعتراض کرنے لگتا ہے۔ مالی کے خلاف زبان اس لیے نہیں کھلتی کہ اس کی بصیرت پر اعتماد ہوتا ہے۔ ہر انسان جانتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودوں کی شاخوں کو بلاوجہ نہیں کاٹتا۔ ایک کی تراش خراش میں دوسرے کی نشوونما کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہ نہ کاٹے تو وہ باغ ویرانہ ہو۔ پھولوں کو توڑ کر بازار میں نہ لایا جائے تو وہ گل فروش کی دکان کی زینت نہ بن سکیں، اور ان کے لیے کسی تجربے کا دامن دراز نہ ہو۔

انبیاء علیہم السلام بھی ایک سے توڑتے ہیں اور ایک سے جوڑتے ہیں۔ ولی کی تراش خراش چمن بندی کے لیے ہوتی ہے اور انبیاء کا عمل وصل حق کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

محبّت کی عطا

دھوبی بعض کپڑوں کو زور سے دھوتا ہے۔ اور بعض کو محبت سے محبت سے دھوئے ہوئے کپڑوں کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ ان سے بوئے محبت آنے لگتی ہے۔ ماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی میں بھی اسی لیے مزا ہوتا ہے کہ وہ محبت کی تخلیق ہوتی ہے۔ بینائی کم ہونے کے باعث ماں خراب روٹی پکا دے تو وہ عجیب لذتوں کی حامل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اسے محبت کے ہاتھ چھوتے ہیں۔ آٹا گوندھتے وقت وہ آٹے میں دل کی محبت بھی گوندھ دیتی ہے۔ جو لقمہ بن کر حلق سے نیچے اترتی ہے تو اس کی تاثیر اور ہوتی ہے۔ محبت کی پیش کش کو صرف محبت بھرے دل ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ تحفہ خود ناہموار سے بچیں جائے۔ دنیا پر اثر انداز ہو کر رہتا ہے۔ قبل از وقت اس کی آمد کی خبر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ محبت کا قاصد دنیا کے تمام قاصدوں سے زیادہ سبک رفتار ہے۔

کنعان میں بوئے یوسفؑ کو کس نے سونگھا تھا؟ یہ بوڑھے باپ کی محبت ہی تو تھی، جو سینکڑوں میل سے خوشبو سونگھ کر مبشر بن گئی کہ یوسف کی قمیص آرہی ہے۔ بشارت کس نے دی؟ اسی محبت نے جو مدتوں سے سینے میں بے قرار تھی، جس پہ ہجر کے طویل زمانے گزر چکے تھے۔

اس بحث میں نہ پڑیئے، کہ جب کنعان کو جب کنعان کے کنوئیں میں ڈالا گیا تھا، تو یعقوبؑ کو خبر کیوں نہ ہوئی۔ یہ بحثیں عقل کی ہیں، جنہیں محبت کی دنیا سے کوئی سروکار نہیں۔ عقل نہیں جانتی کہ محبت جب مضطرب ہوتی ہے، تو اپنی کیفیات میں کھو جاتی ہے۔ اسے ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ جب سنجیدگی اور وقار کی منزل میں آجاتی ہے تو دیکھتی بھی ہے اور سنتی بھی ہے۔ کنوئیں میں گرے ہوئے یوسفؑ کے حال سے بے خبری یعقوبؑ کی محبت کا اضطراب تھا۔ وہ کیا دیکھتی اور کیا سنتی؟ وہ تو اپنے ہی حال میں گم تھی۔ محبت میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تو بو بھی آنے لگی۔ اور اطلاع بھی مل۔ ایک حال محبت کی مدہوشی کا تھا۔ اور ایک معارفت آگاہی کی ساعتیں۔

شاید قدرت کو بھی بوڑھے باپ کی پریشانی منظور نہ تھی۔ اسی لیے باپ اور بیٹے کے درمیان یعقوبؑ کی محبت کو پردہ بنا دیا کہ وہ مہ کنعان کا اضطراب نہ دیکھ سکے۔

مہ کنعان جب کنویں اور قید کے تابات سے نکل کر مصر کے تخت
پر جلوہ گر ہوا۔ تو خود بخود قمیص کی بو آنے لگی۔

اضطراب کی جو ساعتیں بسا اوقات محجوب ہوتی ہیں وہ غل
وہ بھی کرم ہوتی ہیں۔ وقت آنے پر پردے بھی اٹھتے ہیں،
بو بھی آتی ہے اور جمال بھی دکھائی دیتا ہے لیکن مشاہدے
کی اس منزل تک پہنچنے کے لیے یعقوبؑ کا حوصلہ چاہیے
تحمّل۔ دل انسان کیا یوسف گم گشتہ کا جمال دیکھے گا۔ پیچ و اضطراب
شوق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ شوق کی تکمیل کے بعد یوسف گم گشتہ کی تلاش
کے لیے کوہ و صحرا میں نہیں جانا پڑتا۔ قمیص خود چل کر آتی ہے۔ پیغام
یوسف بھیجتا ہے۔ پھر ملاقات کے شوق کا اِدھر سے نہیں اُدھر
سے اظہار ہوتا ہے۔ پیام بھی آتے ہیں اور تحفے بھی۔

حسن اور آئینہ

جو چیز دو مردوں کے لیے مفید ہو، اُس کی نسبت سے ادبی
دنیا میں خیال کے پھول میں وہ بات نہیں ہوتی جو باغ کے پھول میں ہوتی ہے باغ کے پھول کی
دلکشی اور رعنائی جاذبِ نظر بھی ہوتی ہے اور دل نواز بھی۔ اچھے پھول

ان صفات سے عاری ہوتا ہے۔ جو پرندے زیادہ بچے پالتے ہیں انہیں پر بھی زیادہ ملتے ہیں۔ جنگلی بکریوں کے تھنوں میں دودھ نہیں ہوتا۔ اس نعمت سے وہی جانور نوازے جاتے ہیں جنہیں دوسروں کی ضرورتوں کا کفیل بنایا جاتا ہے۔

نعمتوں کی طلب ہو تو دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے جذبات سے دل لبریز ہونا چاہیئے۔ جو بچہ فطرتاً سخی اور کریم ہو، اور ماں باپ سے نعمت پانے کے بعد بہن بھائیوں میں تقسیم کر دے، وہ مزید کا حقدار بنتا ہے۔ ماں کی مامتا اسے محروم دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ دوسرے بچوں کی نسبت اسے زیادہ ملتا ہے، اور رحمت کی نظریں اور شفقت بھرے جذبات اس پر مستزاد ہوتے ہیں۔

رب تعالیٰ کی عادت بھی یہی ہے کہ وہ انسان کو دوسروں کے لیے پریشان و مضطرب دیکھتا ہے، تو اسے سکون کی دولت سے نواز دیتا ہے۔ ایثار کرنے والے اور دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں پر ترجیح دینے والے کبھی محروم نہیں رہتے۔ محرومی خود غرض انسان کا حصہ ہوتی ہے۔ آفتاب بلا امتیاز اپنا نور بانٹتا ہے۔ چمنستانوں اور غلاظتوں پر سایہ فگن ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کی لطافت مجروح نہیں ہوتی، اس کا نور ازل سے دمک رہا ہے اور ابد تک دمکتا رہے

گا۔ ہوا بھی شریف و رذیل کے لیے ہے۔ اس کی فیاضیوں کا سلسلہ کسی خاص حلقے تک محدود نہیں۔ تمام کو مساوی طور پر مستفیض کرتی ہے۔ وسعتیں جتنی بے کراں ہوں گی کرم کے جذبات بھی اسی قدر بے کراں ہوں گے۔ تنگ دل اور تنگ ظرف ذات میں بے کراں جذبات پیدا نہیں ہو سکتے۔

رب تعالیٰ کی ذات چونکہ ہر اعتبار سے بیکراں ہے اس لیے اس کے کرم کا سلسلہ بھی وسیع ہے۔ ایک بخیل بادشاہ کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا وزیر دریا دل ہے جھولی بھر کر تقسیم کرنے کا عادی ہے، تو اسے برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو گا۔

کسی ذی عظمت ذات کو یہ معلوم ہو جائے کہ جن عظمتوں کی وہ مالک ہے انہیں کی جھلک ایک معمولی انسان میں بھی پائی جاتی ہے تو وہ اس پر ہزار جان سے نثار ہو گی۔ ہر حسین اپنی ہی اداؤں کا شکار ہوتا ہے، آئینے سے اس کے غیر معمولی شغف کا اور کیا باعث ہو سکتا ہے کہ اس آئینے میں اپنی ذات نظر آتی ہے اپنی ادائیں دکھائی دیتی ہیں۔ اسی لیے اسے پیشِ نظر رکھتا ہے، سنوارتا ہے اور ٹھوکروں سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ آئینے کو ٹھیس لگ جائے تو اس کے دل پر چوٹ پڑتی ہے۔

بندہ بھی حسنِ مطلق کا آئینہ ہے۔ اسے اپنی اداؤں کی دلفریبیاں دیکھنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ ذات کریم ہے جب اس میں کرم

کی خود دیکھتی ہے تو نثار ہونے لگتی ہے۔ آئینہ گدلا ہو جائے اور اپنی آب و تاب کھو بیٹھے تو حسن کی نظروں میں مرغوب نہیں رہتا اور نہ ہی اسے دیکھ کر حسن کے دل میں کوئی اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔ ناز و نیاز کا سارا کھیل صرف اسی وقت تک کے لیے ہوتا ہے جب تک آئینہ حسن کا مظہر بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

حق کی سربلندی

حق مغلوب ہو تو بہت کم طبیعتیں اس کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ ہر شخص بلال حبشیؓ اور صہیب رومیؓ کا ہم مذاق نہیں ہوتا۔ بینش و دیدہ وری کی نعمت تو ایسی نایاب نعمت ہے کہ جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ حق کو مغلوب اور مصائب و آلام میں گھرا ہوا دیکھ کر جو لوگ اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں ان کی فطرت ہی بلند نہیں ہوتی۔ وہ ازل سے عالی حوصلہ لے کر آتے ہیں۔ ورنہ عموماً یہی ہوتا ہے کہ لوگ نمود و شان و شوکت کو دیکھتے ہیں۔ جس جماعت اور گروہ سے وابستہ ہوتے ہیں اس کے متعلق پہلے سے یہ سوچ لیتے ہیں کہ اس سے وابستگی کے بعد انہیں کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کا منہ دکھا ہوا تک محفوظ

رہ سکتا ہے، ذاتی مفاد اسی وقت بھول سکتا ہے جب انسان مبتلا ہو جائے اس پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جائے اور ظاہر ہے کہ خود فراموشی ہر ایک کا حصہ نہیں ہوتی اس کے لیے خاص روحیں درکار ہوتی ہیں۔ ہر پہاڑ برق تجلی کا اہل نہیں ہوتا اور ہر سینہ جبریل امین کا نشیمن نہیں بن سکتا۔

برق اسی پہاڑ پر گرتی ہے، جیسے موسیٰؑ کے قدم چومتے ہیں جس پر طالب دیدار متمکن ہوتا ہے اور جبریل امین کے جلووں کو وہی روح اپنے اندر جذب کر سکتی ہے جو عشق کی مستی سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ یہ سب قدرت کے عطیات ہیں۔ اور عطیہ ہر ایک کو نہیں ملتا۔ جسے چاہے کریم نواز دے۔

دنیا کو کسی حقیقت سے آشنا کرنے کے لیے ترغیب و تحریص کی ضرورت ہوتی ہے ترغیب و تحریص بھی اسی وقت کام دیتی ہے جب حق کے علمبرداروں کی آواز میں جان ہوتی ہے۔ ان کے سینوں کے سوز کی جھلک ان کی عملی زندگی کے ہر گوشہ پر حاوی ہو ہے سوز بعد ایک دل کو بھی متاثر نہیں کر سکتی وہ بے عمل زندگی سے کسی انقلاب انگیز کارنامے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ چند جانباز اٹھ کر جب کسی حقیقت کا حسن

اجاگر کردیتے ہیں تو ان کا خلوص دوسروں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ حضور علیہ السلام کی مکی زندگی میں جو صحابہؓ کفار کی غلامی میں گرم ریت پہ تڑپ رہے تھے۔ مکہ کی فضاؤں میں گو ان کی صدا بے اثر تھی لیکن جب یہی دیوانے مدینے میں جمع ہو گئے اور انہوں نے اپنی تگ و دو سے خود کو منظم کر لیا تو ان کا عشق رنگ لائے بغیر نہ رہ سکا۔ غلامی کی زندگی میں انہوں نے جس جذب و شوق کا اظہار کیا تھا، اسی کے باعث کفار ان کے متعلق اپنا نظریہ تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئے کہ صحابہؓ کی صورت میں اسلام کی جو قوت ایک مرکز پہ جمع ہو گئی ہے، اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور جب صحابہؓ نے اپنی جاں بازیوں سے غلبہ حاصل کر لیا، قریش مکہ کے بہادروں کے عزائم کو شکست دے دی تو اس حقیقت کا حسن نکھر کر سامنے آ گیا جس کے وہ داعی تھے جس کی طرف قریش کر یار ہے تھے اسلام کے علمبردار اگر اپنی اولوالعزمی سے اسلام کی صداقت کا وہاں نہ منوا لیتے تو قریش کی آنکھیں کہاں کھل سکتی تھیں اور وہ حسن صداقت کا لوہا کہاں دیکھ سکتے تھے؟ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کی مکی زندگی میں نہایت محدود تعداد ایمان لائی۔ اور مدنی زندگی میں ہمیں یدخلون فی دین اللہ افواجاً کا منظر نظر آ رہا ہے۔ حالانکہ نبوت کی مدنی زندگی کی مدت قلیل ہے مکہ میں اسلام کی ترقی کی رفتار اس لئے محدود

رہی کہ اسلام غریب تھا کمزور تھا اور اسے وہ قوت و طاقت حاصل نہ تھی جو کسی نظریہ کو پھیلانے اور عام کرنے کے لیے ضروری ہوا کرتی ہے اور مدینے میں یہ شان و شوکت حاصل تھی۔

زندگی کا مقصود

بچے کا شعور خام ہوتا ہے تو اس کی نظر کھلونوں تک محدود رہتی ہے کھلونوں کا چیک کاٹ کر دید یا جائے تو وہ مطمئن نہیں ہوتا۔

انسان بھی جب اپنی تخلیق کے مفہوم سے نا آشنا ہوتا ہے اور اسے ذہنی بلوغ حاصل نہیں ہوتا تو وہ خام تمناؤں کے جال سے نہیں نکل سکتا۔ اس کی ہر آرزو خام ہوتی ہے۔ ہر طلب ناقص ہوتی ہے۔ ساری زندگی آرزوؤں اور تمناؤں کے قصر و ایوان تعمیر کرتے گذر جاتی ہے اور حیات کا وہ مقصد نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے جس کے لیے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ خدائے تعالیٰ کی توفیق شامل حال ہو تو انسان کو بلند نگاہ عطا ہوتی ہے۔ بلندیاں ہی اس کے فکر و خیال کا محور و مرکز بن جاتی ہیں۔ خام آرزوؤں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کی بجائے وہ اس راہ کو اپنے لیے پسند کرتا ہے جس پر ختم یا شفاعت نہیں ہو۔ بچہ کھلونوں سے مطمئن ہو سکتا

ہے لیکن ایک عاقل و بالغ انسان کو کھلونوں کی چمک دمک متاثر نہیں کر سکتی۔ دنیوی حیات کیا ہے؟ لہو و لعب، کھیل تماشا۔ یہاں ایک پردہ اٹھتا ہے اور ایک گرتا ہے۔ ایک منظر نگاہوں کے سامنے آتا ہے اور اپنی سحر کاریوں کی شان دکھا کر غائب ہو جاتا ہے۔ اس کی جگہ کسی دوسرے منظر کی حیرت زائی لے لیتی ہے۔ حیرت زائیوں اور طرفہ کاریوں کا یہ طلسم تاحیات نہیں ٹوٹتا۔ ہر منظر کی علیحدہ شان ہوتی ہے اور ہر تماشے کی الگ حیثیت۔

زندگی کا مسافر دنیا میں تماشائی کی حیثیت سے نہیں آیا۔ اور نہ ہی اس کے اوقات عزیز ایسی بیکار باتوں کے لیے وقف ہو سکتے ہیں۔ اس کی حیات کا ہر لمحہ گراں قدر ہے۔ کائنات کی ساری دلچسپیاں بھی اس کا بدل نہیں ہو سکتیں جو سانس یاد الٰہی میں صرف ہو۔ کونین کی نعمتوں سے افضل ہے۔ دنیا کی ہر نعمت کا کوئی نہ کوئی بدل ہو سکتا ہے لیکن عالمِ موجودات کی تمام نعمتوں کو دے کر بھی ہم اپنی حیات کے ایک سانس کو واپس نہیں لا سکتے۔

ہر سانس خدا کی امانت ہے اور یہ امانت منعم کی منشا کے مطابق صرف ہونی چاہیئے۔ حیات کا جو لمحہ اپنے خالق و مالک کی منشا کے مطابق صرف ہو، خواہ وہ کس قدر بھی اذیت ناک اور پریشانیوں کا حامل

کیوں نہ ہو۔ دونوں جہاں سے افضل و اعلیٰ ہے۔ مسرتوں میں گزری ہوئی زندگی خواہ کتنی بھی سکون آمیز اور بہجت خیز کیوں نہ ہو۔ اگر وہ غفلت میں گزری ہے، اس میں اپنے مولیٰ کی یاد کی توفیق نصیب نہیں ہوئی حیات کی نعمت جس غرض کے لیے تفویض ہوئی تھی وہ اس سے روشناس نہیں ہو سکی تو وہ بیکار ہے۔

حقیقی زندگی میں یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ دنیا میں رہ کر حیات کا دامن کس قدر مسرتوں سے بھرا، کتنی خوشیاں حاصل کیں؟ وہاں تو صرف یہ سوال ہوگا کہ کس قدر حسنات سمیٹ کر لائے ہو؟ جن راہوں سے بچنے کی تعلیم دی گئی تھی ان سے کس قدر دامن بچایا؟

جو غم انسان کو اپنے مولا سے قریب کر دے وہ اس خوشی سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے جس کا نشہ غافل اور مدہوش بنا دے۔ زمین و آسمان کی مالک و مختار ذات خود بیدار ہے اور وہ بندے سے بیداری چاہتی ہے غفلت اسے پسند نہیں اور غافل دل اس کی محبت کی بو نہیں سونگھ سکتے۔ بیداری خدا تعالیٰ کے منتخب بندوں کو ملتی ہے اور غفلت ان لوگوں کا حصہ ہوتی ہے جن کے مقدر میں محرومی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ بدن کی راحت کے لیے راتیں جتنی بھی کٹ جائیں خدائی بارگاہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ الا یہ کہ دل کی بیداری بھی پیش نظر ہو۔ حیات کے لمحات

کے لیے جدوجہد کرتے وقت۔ اگر انسان دل کی بیداری کو نظر انداز کر دے تو اس کی حیثیت اس بچے سے مختلف نہ ہوگی جو کھلونوں کی چمک دمک میں کھو کر رہ جائے اور اس کی نگاہ اس سرمائے پر نہ ہو جو اس کی حیات کو خوشگواریاں عطا کرنے کا ضامن بن سکتا ہے۔

اضطراب اور سکون

انسان اپنی بداعمالیوں سے اسی دنیا کو اپنے لیے جہنم بھی بنا سکتا ہے، اور یہی دنیا اس کے لیے جنت کا نمونہ بھی بن سکتی ہے۔ جو کچھ ہمیں پیش آتا ہے وہ ہمارے ہی اعمال کا ثمر ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقبول بندوں کو جو ناگواری پیش آتی ہے وہ ان کے عمل کا نتیجہ نہیں ہوتی، بلکہ یہ ان کا امتحان ہوتا ہے جو انہیں خدا تعالیٰ کے اور زیادہ قریب کر دیتا ہے۔ اور ہماری ناگواریاں ہماری شامت اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مقبول بندوں کا امتحان ان کی عظمت کو واضح کرنے کے لیے ہوتا ہے، اور مردود کی مردودیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

جنت اور دوزخ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک خدا کے قہر و غضب کا مقام ہے، اور ایک لطف و کرم کی جگہ جہاں وہ سب کچھ موجود ہوگا

جس سے چشم و گوش اور قلب و روح لذت یاب ہو سکیں گے۔ وہاں احساسات ظاہری اور احساساتِ باطنی کی تسکین کا سامان موجود ہوگا۔ اور دوزخ میں ظاہر و باطن دونوں کو انعاماتِ ربانی سے محروم رکھا جائے گا۔ یہ بات مسلمات کا درجہ رکھتی ہے کہ اضطراب روح سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں۔ ایک انسان راحت کے سامان ہونے کے باوجود بھی اگر روحانی تسکین سے محروم ہے اور اضطراب روح میں مبتلا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا ہے اگر کچھ نہ ہونے کے باوجود روح کو تسکین حاصل ہے تو یہ خدا تعالیٰ کا خاص کرم ہے۔

خدا تعالیٰ قادرِ مطلق ہے جس طرح وہ راحت کے سامان کے ذریعہ راحت پہنچانے پر قادر ہے۔ ایسے ہی راحت کے سامان نہ ہونے کے باوجود بھی راحت پہنچا سکتا ہے۔ ایسے ہی وہ دوزخ کے ذریعہ بھی عذاب دے سکتا ہے، اور دوزخ کے بغیر بھی عذاب الیم میں مبتلا کر دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس لیے ہمیں مال اور اولاد طلب کرتے وقت یہ دعا کرنی چاہیے کہ یہ مال و اولاد ہمارے لیے فتنے کا موجب نہ بن جائیں۔ ہمیں زندگی کے سکون سے محروم نہ کر دیں۔ اور ہماری تخلیق کا مقصد اوجھل نہ ہو جائے۔ جس کے لیے ہماری تخلیق ہوئی ہے۔ تخلیق کا مقصد جاہ و مال کا حصول ہی نہیں۔ یہ چیزیں

تو فرعون و ہامان اور شداد و نمرود کو بھی حاصل تھیں، لیکن وہ زندگی کی ان راحتوں سے محروم تھے، جو خالصتاً خدا تعالیٰ کے اطاعت گذار اور فرمانبردار بندوں کا حصہ ہوتی ہیں۔ ابوجہل کو نرم و گداز بستر پہ وہ سکون حاصل نہ تھا، جو ابوذر غفاریؓ کو اپنی جھونپڑی پہ پرانی گدڑی میں مل رہا تھا۔ ان کے نرم لقموں کو ان سوکھے ٹکڑوں سے کیا نسبت ہو سکتی ہے، جو صحابہؓ کو بارگاہِ نبوی سے مل رہے تھے۔

محبت کی عطا میں یہ تاثیر ہے کہ وہ جزوِ بدن بننے کے بعد خیبر شکن بن جاتی ہے، مُردوں پر نظر ڈال دے تو ان میں زندگی کا تازہ خون دوڑنے لگتا ہے۔ ناجائز ذرائع سے حاصل کیا ہوا مال چہرے پر سرخی تو لا سکتا ہے، لیکن اس میں مردوں کو زندگی بخشنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، وہ تو خون بننے کے بعد جسم و جان کو سکون سے محروم کرے گا۔ اس کے ذریعہ جو فاسد مادہ پیدا ہوگا، وہ خدا تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دے گا۔ حیات میں انتشار پیدا کرے گا اور اس ملت کے لیے رسوائی کا موجب بن جائے گا، جو اس سے منسوب ہوگی۔ سکون حلال کا مال بخش سکتا ہے۔ اعجازِ نماز کی شان اسی تمے میں پیدا ہوگی جو خدا تعالیٰ کے فرمانبردار بندے کی رگوں میں خون بن کر دوڑے گا، خواہ وہ کتنا ہی بے حقیقت کیوں نہ ہو۔

عطا اور بلا

زندگی میں انسان کو تین حالتیں پیش آسکتی ہیں۔

ایک یہ کہ آسودہ حال ہو اسے کوئی ناگواری پیش نہ آئے جو آرزو کرے وہ پوری ہو جائے۔

یہ حالت انتہائی خطرناک ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں خود سر اور متکبر بن کر بھٹکنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں اور شکر گذار بننے کی کم امید ہوتی ہے۔ فرعون کو اس کی کامیابیوں نے فرعون بنا دیا تھا۔ مفلس ہوتا تو کبھی خدائی کا دعویٰ نہ کرتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ انسان کی بعض آرزوئیں پوری ہوں اور بعض پوری نہ ہوں۔ رنج و غم و عیش و آرام زندگی کے ساتھ ساتھ رہیں کبھی ارمانوں کے گلستانوں میں بہار آجائے اور کبھی آرزوؤں کے چمنستان اُجڑتے دکھائی دیں۔ یہ دھوپ چھاؤں حیاتِ انسانی کے لیے مفید ہوتی ہے۔ یاس کا اندھیرا بھی عجز کی شان پیدا کر کے بندے کو مولا کے قریب کر دیتا ہے اور مسرت کی چاندنی بھی عرفانِ حیات بخشتی ہے غم میں انسان صبر کر کے اجرِ جزیل کا مستحق بن سکتا ہے اور مسرت شکر کی

طرف رہنمائی کرے گی۔ صبر اور شکر دونوں متوسط حالت کے ثمرات ہیں۔

تیسری حالت ابتلاء و امتحان کی ہے۔ اس حالت میں ہر انسان ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔ مایوس ہو کر خدا سے کٹ جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ ایوبی شان حضرت ایوب علیہ السلام کا حصہ تھی۔ اور حسینؓ کا صبر انہی کے شایانِ شان تھا۔ ظاہر ہے خاصانِ بارگاہ کی میراث عوام کو نہیں بلکہ خواص ہی اس کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے ایسے ابتلاء و امتحان سے بھی پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے جس کی انسان استطاعت نہ رکھتا ہو۔ غرض نہ وہ تمول بہتر ہے جو عجز و نیاز سے بے نیاز سے بے نیاز کر دے اور نہ فقر و فاقہ کی وہ زندگی جو سراسر ابتلاء و امتحان ہو۔

بیچ کی راہ اعتدال کی راہ ہے اسی میں رہ کر انسان صابر بھی بن سکتا ہے اور شاکر بھی۔ مصیبت پر صبر کرنا توفیقِ ربانی کے بغیر ممکن نہیں چہ جائے کہ انسان شکر کرنے لگے۔ مصیبت پر سجدۂ شکر ادا کرنا خاندانِ نبوت کا شیوہ ہے۔ یا ان لوگوں کو یہ سعادت نصیب ہو سکتی ہے جو میراثِ نبوت پانے کے اہل ہوں۔ ما و شما کے لیے تو بعض حالتوں میں صبر کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

حضرت شفیق بلخیؒ کی محفل میں ایک دفعہ کا شکر کا مضمون چھڑ گیا۔ ایک بزرگ نے کہا کہ ہم لوگوں کا معمول یہ ہے کہ مل جائے تو کھا لیتے ہیں، نہیں ملتا تو شکر کرتے ہیں۔

شفیق بلخی رح نے فرمایا، بلخ کے کتوں کا بھی یہی حال ہے مل جاتا ہے تو کھا لیتے ہیں ورنہ مالک کے دروازے پر صبر کیے پڑے رہتے ہیں۔ نووارد بزرگ نے حیرت سے پوچھا "بلخ کے عارفین کا کیا معمول ہے؟"

"شفیق بلخی رح بولے "یہاں یہ رواج ہے کہ مل جاتا ہے تو بانٹ دیتے ہیں نہیں ملتا تو شکر کرتے ہیں" عطا پر شکر آسان ہے لیکن بلا پر شکر بہت مشکل ہے۔ سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی کہہ کر سر تو وہی پیش کر سکتا ہے جو قتیلِ ناز بننے کی لذت سے واقف ہو۔ شہیدِ ناز بننے کی لذت کی حقیقت سے ہر شخص کو آگاہی کہاں دی گئی ہے۔

بلا پر شکر کی ہمت نہ ہو تو پھر عطا کی آرزو ہونی چاہیے، عطا بھی ایسی جو انسان کو غافل نہ بنا دے۔ مولا سے رشتہ توڑنے کا موجب ثابت نہ ہو بلکہ تعلق میں اور زیادہ استواری پیدا کر دے اور ظاہر ہے کہ وہ ایسی ہی عطا ہو سکتی ہے جس کے ساتھ کچھ آزمائشیں بھی ہوں کچھ ناگواریاں بھی وا ورنہ انسان کے فرعون بننے کا اندیشہ ہے۔

بلا جو [illegible] ہو تو حقیقتاً وہ بھی عطا ہی کا درجہ رکھتی ہے۔ حکیمِ حاذق کی کڑوی دوا بیمار کو بھی شفا بخش ہوتی ہے وہ چاہے تلخ بھی ہو تو آبِ حیات کا حکم رکھتا ہے۔

تلاش اور جستجو

دامن میں غلاظتیں سمیٹنے کے بعد کوئی شخص خوشبو کی آرزو کرنے لگے تو اس کی یہ کوشش بیکار ثابت ہوگی۔ خوشبو کی طلب ہو تو غلاظتوں سے کنارہ کش ہونا پڑے گا، ان چمنستانوں اور خیابانوں میں سکونت اختیار کرنی پڑے گی جہاں رنگارنگ کے پھول کھلتے ہیں۔ غلاظت سے کرکٹ باغ میں چلا جائے تو پھولوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکے گا۔ خوشبو سے استفادہ کرنے کے لیے دامن کا غلاظتوں سے پاک ہونا ضروری ہے۔ ورنہ خوشبو مزا نہ دے گی، چمن کی رنگا رنگی دل میں کوئی نشاط کا جذبہ پیدا نہ کر سکے گی، روح کو ان کیفیتوں سے آشنا نہ کر سکے گی جنہیں پھولوں کا فیضان کہا جا سکتا ہے۔ ایک ذات سے فیضان حاصل کرنے کے لیے اس کی مخالف اور متضاد ذات سے رشتہ منقطع کرنا پڑتا ہے۔ سردی اور گرمی، بہار اور خزاں، شگفتگی اور پژمردگی، رنج اور راحت، اضطراب اور سکون، نور اور ظلمت، غم اور خوشی وغیرہ کی متضاد و مختلف کیفیتوں سے بیک وقت استفادہ ممکن نہیں ہوتا۔ دھوپ سے

بچنے کے لیے درخت کے سائے میں آنا پڑتا ہے۔ لعنتوں سے نجات حاصل
کرنے کے لیے نور کی طلعتیں درکار ہوتی ہیں۔ خوشی کے جذبات غم سے
نجات کے بعد ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔ بہار کی شادابیوں کے لیے فصلِ خزاں
کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ثواب کی لذت درکار ہو تو گناہوں سے اجتناب
کرنا پڑے گا۔ خدا کی رحمت کی طلب ہو تو عتاب کے مقامات سے گریز
کرنا لازمی ہو گا۔ لق و دق صحرا میں پھول نہیں کھلتے تنگ و تاریک
کمروں کی ظلمتوں کو منور کرنے کے لیے آفتاب نے کبھی اپنی وضع
نہیں بدلی، دمکنا اور منور کرنا ازل سے اس کا شعار ہے لیکن ان
سے مستفیض ہونے کے لیے ان مقامات کو خیرباد کہنا پڑتا ہے جہاں
ظلمتوں کا بسیرا ہو۔ اور نور کے پہنچنے کیلئے تمام راہیں مسدود کر دی گئی ہوں
تنگ و تاریک کمرے کو منور کرنے کے لیے اس دیوار کو منہدم کر دینا
ضروری ہوتا ہے جو آفتاب اور کمرے کے درمیان حدِ فاصل بنی ہو۔ دل اسی
وقت انوارِ الٰہیہ سے منور ہو سکتا ہے جب غفلت کے دبیز پردوں کو چاک
کر دیا جائے۔ والہانہ دعا کی تاثیر سے انکار نہیں لیکن انسان اگر اپنی روش
نہ بدلے تو مشیت اس کے ارادوں کی پابند نہیں ہو سکتی۔ دعا کے ذریعہ
سورج کو تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں محصور نہیں کیا جا سکتا۔ موسم
اپنے وقت پہ بدلے گا ور ڈوبنے والوں کی طلب سے گر کوئی [illegible] کے

سائے میں آجائے تو منور ہو کر رہے گا۔ جلووں کی طلب ہو تو نور سورج کے سائے میں آنا پڑے گا، ظلمتوں کے اس حصار کو توڑنا پڑے گا جو ظلمتوں اور محرومیوں کا باعث ۔ خدا کی رحمتیں اس انسان کو نوازتی ہیں جو رحمت کا طلبگار ہو کر ان کی تلاش و جستجو میں نکلتا ہے۔ تلاش و جستجو جب حد کمال کو پہنچ جاتی ہے تو کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ خدا کی رحمتیں خود بندے کی تلاش میں سرگرم عمل نظر آنے لگتی ہیں۔ لیکن یہ مقام اور مرتبہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہاں صدیق دل درکار ہوتے ہیں جو تپش و گداز کی نعمت سے مالا مال ہوں۔ طلب حد سے فزوں ہو جاتی ہے اور بیچارگی قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دیتی تو قدرت اپنے قوانین بدل ڈالتی ہے، ہاجرہؑ کے سینے کا سوز معصوم بچے کے قدموں میں پانی کا چشمہ بن کر ابلنے لگتا ہے، اور ایک دنیا اس سے سیراب ہوتی ہے، ایک صدیق دل کی طلب بسا اوقات دوسروں کے لیے بھی پیامِ رحمت ثابت ہوتی ہے، اور ایک شقی کی شقاوت دوسروں کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ یہ قدرت کے کرشمے ہیں، طلب کے مظاہر ہیں اور ایسی قدرت کاریوں سے انسان اپنے لیے سامانِ بصیرت فراہم کر سکتا ہے۔

عظیم سہارا

خدا تعالیٰ کی راہ میں بندہ جب اخلاص مندی سے قدم اٹھا تا ہے تو اس پر عرفان و آگہی کی راہیں کھلنے لگتی ہیں۔ ناہموار راستے خود بخود ہموار ہونے لگتے ہیں اور رحمتِ خداوندی بڑھ کے اسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ لیکن یہ منصب ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ جو دل یقین کی دولت سے مالا مال ہوں خوارق کا ظہور بھی انہی کے لیے ہوتا ہے۔ ظاہر بین معجزات کا انکار کرتے ہیں لیکن محبت بذاتِ خود معجزہ ہے۔ بدر و احد اور خندق میں جن عجائباتِ قدرت کا ظہور ہوا وہ صحابہؓ کی محبت کی کرشمہ سازیاں ہی تو تھیں۔ صحابہؓ کو حضورؐ کی ذات سے یہ عشق نہ ہوتا، وہ حضورؐ پہ جان و دل سے فریفتہ نہ ہوتے، اور ان کی رگوں میں محبت موجزن نہ ہوتی تو دنیا کو وہ حیرت انگیز مناظر دیکھنے کیسے نصیب ہوتے۔ جن کی یاد بھی دلوں میں زندگی پیدا کر دیتی ہے۔ صدق و اخلاص کی دولت سے معمور دل ہمیشہ دوسروں کے لیے بھی طمانیت کا موجب ثابت ہوتے ہیں۔ ریب و شک سے یقین کی دولت ہاتھ نہیں آتی۔ کُلی اعتماد کسی ذات سے کامل وابستگی کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ جس ذات سے نسبت نہ ہو اس پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ ہوتا ہے کامل محبت کا اور

لیے ایمان کو محبت قرار دیا گیا ہے اور محبت کے پیرایہ کی حیثیت ایک بے جان قالب کی ہے بدن میں جان نہ ہو تو حرکت نہیں ہو سکتی۔ انسان نہ دیکھ سکتا ہے نہ سن سکتا ہے۔ کفار کو مردہ کہا گیا ہے اس لیے کہ وہ ایمان کی دولت سے محروم ہیں۔ ان میں خدا اور رسول کی محبت نہیں۔ وہ جس چیز کو اہلِ دنیا زندگی سے تعبیر کرتے ہیں، اس کی تو ان میں کوئی کمی نہیں۔ وہ کھاتے پیتے بھی ہیں اور چلتے پھرتے بھی ہیں، لیکن باایں ہمہ وہ محبت کی بو سونگھنے سے قاصر ہیں۔ اسی لیے چون وچرا میں پڑے رہتے ہیں۔ محبت چون وچرا نہیں جانتی اور مشکلات سے گزرنے کے بعد بھی صدیق رہتی ہے۔ اس کے پاؤں میں لغزش نہیں آتی۔ محبت کا ہر قدم اعتماد کے ساتھ اٹھتا ہے اور اعتماد کے سہارے ہی محبت واصلِ منزل ہوتی ہے۔ محبت کی راہ میں مشکلات کے دریا تو ہیں لیکن ریب و شک کے دلدل نہیں۔ ریب و شک کے دلدل عقل کی وادی میں ہوتے ہیں جو ٹٹول ٹٹول کر چلتی ہے۔ اندھے کی رفتار اور بینا کی رفتار میں فرق ہوتا ہے ایک کو ہر قدم پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ منزل نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے ایک کے قدم میں بھی اعتماد ہوتا ہے اور منزل بھی نگاہوں میں ہوتی ہے۔

جو لوگ عقل کی رہنمائی میں آخرت کا سفر طے کرنے کی کوشش کرتے

ہیں ماں کی مثال اندھوں سے مختلف نہیں ہوتی۔ نادیدہ راہوں میں قدم قدم پہ بھولنے بھٹکنے کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی محبت ایک نور ہے جسے رہنما بنا لیا جاتا ہے۔ تو بھولنے بھٹکنے کے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ بچہ جب ماں کی گود کی طرف لپکتا ہے، تو گر بھی جاتا ہے۔ لیکن اس کی افتاد ماں کی محبت کو متحرک کر دیتی ہے اور وہ بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ سہارا ہمیشہ محبت دیتی ہے۔ عقل کیا سہارا دے گی؟ وہ تو خود سہاروں کی تلاش میں ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی محبت کا سرمایہ دامن میں موجود ہو تو یوں کہیے کہ سہارا موجود ہے ہر جگہ یہ سہارا کام دے گا۔ اور اگر ٹھوکر لگی بھی تو محبت بے قرار ہو کر سنبھالنے آ جائے گی۔

صدیق اور زندیق

صدیق اور منافق میں یہ فرق ہے کہ منافق کسی نظام کا وہیں تک ساتھ دے سکتا ہے جہاں تک اسے یہ یقین ہو کہ اسے اس تعاون میں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بلکہ قدم قدم پر فوائد و منافعات حاصل ہوتے رہیں گے جہاں بھی اسے نقصان کا اندیشہ لاحق ہوا وہ نظام کار سے دامن بچا کر الگ ہو جاتا ہے۔ اور اسے ان مواعید کا ذرہ برابر احساس نہیں

ہوتا جو اس نے کسی نظام کے وفادار کی حیثیت سے کیے ہوتے ہیں۔

صدیق انسان کا طرزِ عمل اس سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ وہ فوائد حاصل کرنے کے لیے کسی نظام کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ اس کے پیش نظر اس نظام کی بہبود ہوتی ہے، جسے اس نے صدیق انسان کی حیثیت سے قبول کیا ہوتا ہے۔ فائدہ ہو یا نقصان وہ اپنی روش نہیں بدلتا۔ اس کے طرزِ عمل میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بلکہ مصائب و آلام کے طوفان اس کے پائے استقلال میں لغزش پیدا کرنے کی بجائے اور زیادہ استواری پیدا کر دیتے ہیں، وہ نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ اٹھتا ہے، اور ان طوفانوں کا منہ پھیر کر رکھ دیتا ہے جو اس کی راہ میں حائل ہو کر اسے منزل سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا منزل سے دور کرنے کا ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ صدیق انسان کے سامنے اپنا مفاد نہیں ہوتا۔ نظام کی بہتری ہوتی ہے۔ اس نظریۂ حیات کا ارتقا، اسے جان و دل سے عزیز ہوتا ہے جس کی عظمتوں کا پرچم لے کر وہ میدان عمل میں نکلتا ہے۔ عشق و محبت کی راہ، ایثار و قربانی کی راہ ہے۔ ہر نظریہ اپنے فروغ کے لیے اپنے پیروکاروں کا خلوص چاہتا ہے۔ ایثار کا مطالبہ کرتا ہے قربانی کا طلبگار ہوتا ہے ایثار و قربانی کے بغیر کوئی مشکل راہ ہموار نہیں ہو سکتی۔ یہ کامیابی تب ایسی بے پناہیوں کو حاصل ہوتا ہے جن کے سامنے کوئی

نہیں ٹھہرتی۔ ہر دیوار عزائم کے سیلاب کے سامنے بے کار ثابت ہوتی ہے۔ خواہ وہ کتنی بھی مضبوط اور محکم کیوں نہ ہو۔ منافقین کی یلغار صرف اسی دیوار کی طرف ہوتی ہے، جس کی حیثیت ریت کے انبار سے زیادہ نہ ہو۔ آسانیاں انہیں رہزنی کی دعوت دیتی ہیں اور صدیق انسانوں کی زندگی میں ہمیشہ چنگھاڑتے طوفان ہوتے ہیں۔ انہوں نے ان کا منہ پھیرا ہے۔ انہیں شکست دی ہے، اور انہیں مطیع و منقاد بنایا ہے۔ مصائب و آلام کے طوفان ایک ایسی کسوٹی کی حیثیت رکھتے ہیں جو کھرے کھوٹے میں امتیاز پیدا کر دیتی ہے۔ منافقین کو صدیقوں سے جدا کر دیتی ہے۔

حضورؐ کی مکی زندگی مصائب و آلام سے عبارت تھی چاروں طرف قریش کے مظالم کا طوفان منڈلا رہا تھا۔ اس لیے کسی منافق کو یہ طوفان عبور کر کے حضورؐ تک پہنچنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حضورؐ تک وہی لوگ پہنچ سکے جو صدیق تھے، جو طوفانوں میں کود نے کا عزم رکھتے تھے اور جن کی طلب اتنی صادق تھی کہ کوئی طوفان اس کی بے پناہی کو کم نہ کر سکا۔ مدنی زندگی کے لیل و نہار اور تھے۔ یہاں اسلام کو آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع مل گیا تھا۔ اس پر زندگی کی راہیں کشادہ ہو چکی تھیں، اسی لیے منافقین کو چور دروازے سے گھسنے کا موقع مل گیا۔ لیکن

غزواتِ نبوی کی حشر سامانیوں نے یہاں بھی صدیق اور زندیق کو الگ
الگ گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ صدیقوں نے آگے بڑھ کر طوفانوں کو
روکا، جان و مال کی قربانیاں دیں اور بدر و حنین کے معرکوں میں اپنے
خلوص کا مظاہرہ کر کے ابدی سعادتوں کو حاصل کیا۔ سعادتیں ان کی
تھیں اور وہ سعادتوں کے مالک و مختار۔ لیکن زندیق مشکلات کی
بے پناہیوں کا سامنا نہ کر سکے۔ وہ ان سعادتوں سے محروم رہے
جو صدیقوں کا حصہ ہوتی ہیں۔ زندیق کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر
امتحان میں ذہانت کا سہارا لیتا ہے، بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ صدیق
دل کا یہ شیوہ نہیں، وہ محبوب کو مشکلات میں گھرا دیکھ کر بے تاب ہو جاتا
ہے۔ اور جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ جان دے کر بھی اگر وہ محبوب
کی عظمت کا تحفظ کر سکے تو اس سودے کو سستا جانتا ہے۔ جوشِ عشق
چوٹ کھا کر تمتمانے لگتی ہے اور محبت زخم کھا کر بھی دعا دیتی ہے،
وہ مجسم دعا اور تشکر بن جاتی ہے کہ اسے جاں نثاریوں کا موقع ملا۔ جان
کا نذرانہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

پکار اور جیت

کافر و مومن کی زندگی میں یہ بنیادی فرق ہے کہ کافر کی تمام تر تگ و دو اسباب پر مرکوز رہتی ہے اور مومن خدا کو حاجت روا جانتا ہے۔ اسباب کے فراہم ہونے کے بعد کافر مطمئن ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا تکیہ انہی پر ہوتا ہے۔ مومن نہ اسباب کی فراوانی میں خدا کو بھولتا ہے نہ ہی ان کے فقدان کے باعث کبیدہ خاطر ہوتا ہے۔ ہر حال میں وہ خدا کی نصرت و اعانت کا طالب رہتا ہے۔ مایوسی اس لیے اس کے قریب نہیں پھٹکتی کہ اسے خدا کی ذات پر کامل اعتماد ہوتا ہے۔ خدا کی ذات سے اعتماد اٹھ جانے کا نام کفر ہے اور اعتماد قائم ہو جانے کا نام اسلام ہے۔ کافر کا چونکہ خدا کی ذات پر ایمان نہیں ہوتا اس لیے وہ اعتماد کی دولت سے محروم ہوتا ہے۔ اعتماد تعلق سے پیدا ہوتا ہے اور تعلق کو محبت جنم دیتی ہے۔ جب محبت ہی نہ ہو تو تعلق کہاں کا اور اعتماد کیسا؟ یہ تو سارے کھیل ہی محبت کے ہیں۔

منیبت [illegible] کی طرف رجوع کرتا ہے جب [illegible]

اعتماد ہو پکارنا ہی تعلق کی دلیل ہوتا ہے۔ دل میں کسی کی محبت نہ ہو تو پکار بن کر زبان پر نہیں آتی پکارتی بھی محبت ہے اور فریاد رس بن نصرت کے لیے آتی ہے تو وہ بھی محبت ہی ہوتی ہے۔ دل سے کسی کو پکارا جائے تو اس کا براہ راست دل پر اثر ہوتا ہے۔ محبت کی پکار ظاہری آداب و رسوم کی پابند نہیں۔ دل کی زبان دل سمجھتا ہے اور قلبی کیفیات کے اظہار و بیان کے لیے فصیح و بلیغ الفاظ کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ جذبات کے سمندر سے اٹھنے والی ایک موج وہ تلاطم بپا کر دیتی ہے جو کھوکھلے الفاظ سے پیدا نہیں ہو سکتے۔

بچہ کتنی زبانیں جانتا ہے؟ لیکن اس کی پکار ماں کو اس قدر بے تاب کر دیتی ہے کہ سینے میں اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے اور وہ آغوشِ رحمت کھولنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ رحمت کی آغوش دلیلوں سے نہیں کھلتی ہے محبت کی پکار کھولتی ہے۔ جو دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہوتے ہیں اور انہیں کھولنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی انہیں محبت کے چند آنسو کھول دیتے ہیں۔ محبت پکار بن کر آتی ہے تو محروم نہیں رہتی اور سند کا تار تار نچوڑ دیتی ہے۔ اپنا سارا درد محبوب کے دل میں انڈیل دیتی ہے۔ محبت کا یہ رویہ کتنا خطرناک ہوتا ہے، کتنا موثر اور نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے۔

میدانِ بدر میں تین سو تیرہ کو کفر کے مقابل کھڑا کرنے کے بعد حضورؐ کی سجدہ ریزیوں کا جو عالم تھا، جس قلق و اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا اور جسے دیکھ کر صدیق اکبرؓ پریشان ہو گئے تھے۔ آخر وہ کیا تھا؟ وہی محبت کا اضطراب تو تھا جو نصرت بن کر سامنے آیا تھا۔

میدانِ حشر میں سارے نبیؑ نفسی نفسی اور حضورؐ اُمتی اُمتی پکاریں گے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کو اپنی امت سے جو محبت ہے وہ کسی نبی کو اپنی امت سے نہیں۔ پکار یہاں بھی محبت کی ہو گی اور جیت بھی محبت کی۔

مقبولیّت کی علامات

خدا تعالیٰ کا خصوصی کرم ہوتا ہے تو بندے کو عبادت کی توفیق نصیب ہوتی ہے، توفیقِ ربّانی شاملِ حال نہ ہو تو عبادت ممکن نہیں ہوتی دنیا کے ذی جاہ اور ذی عظمت لوگ بھی ناپسندیدہ عناصر کو اپنی بارگاہ میں نہیں گھسنے دیتے کسی حادثے کی بنا پر انہیں باریابی نصیب ہو بھی جائے تو وہ کبیدہ خاطر رہتے ہیں۔ بارگاہ کا قرب انہیں وہ کیف و سرور عطا نہیں کر سکتا جو قرب کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے زبان پر ذکر

آتا بھی ہے تو محض رسمی، جو اور بے مزہ کر دیتا ہے نہ دل ہی سے کوئی موج
نشاط اٹھتی ہے اور نہ احساسات ہی میں محبت کی حرارت محسوس ہوتی
ہے۔ احساسات میں حرارت تو اسی کا نام زبان پہ آنے سے محسوس ہوگی
جو دل میں بسا ہو۔ اس کا نام بھی مزہ دے گا اور یاد بھی رگ و ریشے میں
بجلیاں بھر دے گی۔ اجنبی کے ذکر سے روح کیا لذت پا سکتی ہے؟
بیگانے کی یاد میں مستیاں کہاں؟

روحانی رشتہ قائم ہو تو یاد بے مزا نہیں ہو سکتی۔ دوست کا ذکر
بھی کیف انگیز ہوگا۔ اور یاد بھی مستیوں اور سرشاریوں کے لامتناہی
سلسلے کی خالق بن جائے گی۔ خیال میں بت کدے آباد ہوں۔ دل بتوں
کی جلوہ گاہ بنا ہو تو وحدہٗ لاشریک کے آستانۂ جلال و جبروت پہ جبہ
ریزیوں کے باوجود توحید کا کوئی جلوہ روح و قلب کو تجلیوں اور تابشوں
سے منور و متنبہ نہیں کر سکتا۔

ایک سے واصل ہونے کے لیے دوسرے سے کٹنا پڑتا ہے۔
دنیا والوں کو تو ان کے دشمنوں سے تعلق قائم رکھنے کے باوصف اپنی وفا
داریوں کا یقین دلا کر دھوکے میں رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک سمیع
بصیر اور دلوں کے چھپے ہوئے بھیدوں سے واقف ذات کے ساتھ
ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تو عیاری کی منزلت ہو —

مکاری کو بدترین جرم قرار دے کر راندۂ درگاہ ٹھہرایا جائے گا۔ عیار اور مکار انسان کو دنیا والے دھتکار دیتے ہیں تو اسے قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔ رب تعالیٰ پھٹکار دے، تو اپنا نام لینے کی توفیق چھین لیتا ہے، اپنی یاد کی لذتوں سے محروم کر دیتا ہے۔ کسی شخص سے ہمارے تعلقات خراب ہوں تو ہم اسے اپنی ذات کے لیے سرمایہ صرف کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ضرورت خواہ کتنی بھی شدید ہو، ہماری غیرت دشمن کے سرمایہ سے ہمیں ضرورت پوری کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ رب تعالیٰ جو غنی ہے، جو ہر قسم کے خزانوں کا مالک ہے اور جس کی غیرت کی کوئی انتہا نہیں، اس سے یہ کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ مبغوض اور راندۂ درگاہ انسانوں کو اپنی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائے گا؟ یہ توفیق تو انہی کو نصیب ہوتی ہے جن سے محبت کا رشتہ قائم ہو اور انہیں تو انعام مقصود ہو۔ شداد، ہامان اور مردود فرعون کے پاس دولت کی کیا کمی تھی؟ لیکن کیا انہیں حاجت مندوں کی مدد کی توفیق نصیب ہوئی؟ خدا تعالیٰ کی مخلوق کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے افلاس کی آگ میں جلتے دیکھا، لیکن وہ ان کی دستگیری نہ کر سکے۔ ان کے سامنے [illegible] اپنی ضرورت کو [illegible] کے [illegible] جو لوگ اب بھی راندۂ درگاہ ہیں، وہ [illegible] کے لیے اپنا سرمایہ [illegible] کی طرح بہا دیتے ہیں لیکن یتیموں [illegible]

نہیں ہوتا۔ احساس کی کوئی تپش محسوس کئے بغیر وہ قریب سے گزر جاتے ہیں۔ یہ سب مردودیت کی علامات ہیں۔

مقبول ادائیں

سخی کی بارگاہ کے دروازے انہی لوگوں کے لیے کھلتے ہیں جنہیں [illegible] مقصود ہوتا ہے تو کوئی کریم ذات نہ گدا کی آواز کو شایانِ توجہ سمجھتی ہے اور نہ ہی اس کے لیے اپنی بارگاہ کے دروازے کھولتی ہے۔

دروازہ کھلنا کرم کی علامت ہوتا ہے۔ آواز پر توجہ نہیں [illegible] نہیں ہوتی تو وہ منفعت بخش ثابت ہوتی ہے۔ گدا کی آواز کا سوز دراصل سخی کے جذبۂ رحم و کرم کا پرتو اور فیضان ہوتا ہے۔ سخی ملتفت نہ ہو تو گدا کی آواز میں سوز پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ صدا دے بھی تو بے کیف ہوگی۔ روح میں کوئی نشہ اور کیف پیدا نہ کر سکے گی۔

صدا کا نشہ اور کیف دل کی شکستگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور دل میں کیف اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب دل مطمئن ہو کہ صدا سخی کے دل پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ وہ سن رہا ہے۔ صدا پر توجہ ہے۔

سخی کی توجہ گدا کے دل کی شکستگی میں وہ قوت بھر دیتی ہے جس سے سوز گدا کی آواز میں

ظاہر ہونے لگتا ہے۔ جس سے سننے والے ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ گدا خود مستیوں میں جھومنے لگتا ہے۔ یہ احساس اسے قطعاً پریشان نہیں کرتا کہ صدا دیتے ہوئے دیر ہو گئی ہے۔ اور ابھی سخی کا کرم عطا کی صورت میں ظاہر نہیں ہوا۔ اس یقین سے اس کا دل معمور ہوتا ہے کہ عطا کے ظاہر ہونے میں جس قدر تاخیر ہو رہی ہے۔ اسی قدر کرم کا زیادہ مستحق بنتا جا رہا ہوں۔ صدا مردود ہوتی تو اس قدر ٹھہرنے اور مانگنے کی اجازت نہ ملتی۔ فوراً دھتکار دیا جاتا۔ صدا مقبول ہو گئی ہے تو مردود کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ جب بھی کرم کا ہاتھ اٹھے جھولی بھر جائے گی توقع سے زیادہ عطا ہو گا۔

جو لوگ ازلی مردود ہوتے ہیں انہیں خدا کی بارگاہ سے مانگنے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ مانگنے کے لیے کھڑے ہو بھی جائیں تو ان کی آواز میں وہ سوز و درد پیدا نہیں ہوتا جو مقبولیت کی علامت ہوتا ہے۔ یہ سوز و درد صرف انہی کو ملتا ہے جن پر رحمت نثار ہوتی ہے۔ صدا کی مقبولیت عطا کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ صدا قبول ہو جائے تو گدا بھی مقبول ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں تاخیر مضر نہیں ہوتی۔ بلکہ مفید ہوتی ہے۔ صدا میں جتنا وقت گزرتا ہے

وہ اتنا ہی گدا کو مقبولیت کے قریب لانے کا موجب ثابت
ہوتا ہے۔ کرم کی امید جب درد بن کر دل میں سما جاتی
ہے تو صدا بن کر زبان پہ آجاتی ہے اور انعام بن کر
جھولی میں آکر رہتی ہے۔

صدا، درد اور انعام یہ سب سخی کے انعامات ہیں۔ سخی نہ چاہے تو گدا کے سینے میں نہ درد پیدا ہو سکتا ہے۔ نہ زبان پہ احساسات میں تکلم پیدا کرنے والی صدا آسکتی ہے اور نہ انعام مل سکتا ہے۔ جس گدا کو صدا کا سوز مل جائے انعام اس کا حق ہوتا ہے۔ درد سے محروم گدا کی آواز بے اثر ہے۔ اس سے کمالات کی امید نہیں کی جا سکتی۔ کفیل وہی صدا بنتی ہے جو مقبول و محمود ہو۔ درد مل گیا تو مراد مل گئی۔ صدا تو صرف ساتھ نبھانے کے لیے مانگی جاتی ہے یا زیادہ سے زیادہ اسے ذوق کا غماز کہا جا سکتا ہے تاکہ تشنگی کو آواز میں ڈھال کر سخی کے کان تک پہنچایا جا سکے۔ جو ذات علیم و خبیر ہو اس کے سامنے اظہار و بیان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ دلی کیفیت سے واقف ہوتی ہے درد کا اظہار تو اپنے ذوق کی بے تابی کے لیے ہوتا ہے یا یوں کہیے۔ درد کو بیان سے تسکین ملتی ہے یہ کیفیتیں صرف اپنی ہیں کیونکہ مقبول کی آرزو نامراد نہیں ہوتی اور مردود کو مقبول کی ادائیں نہیں ملتیں۔

حدِ بغاوت کی ضرورت

کسی ذات کی حاکمیت تسلیم کر لینے کے بعد انسان کو اس کے اشاروں کا پابند ہونا پڑتا ہے اسی کی خواہشات و مرضیات کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک ذات کے اقتدار کو تسلیم کر لیا جائے خود کو اس کی تحویل میں دے دیا جائے لیکن اس کی اطاعت کے بجائے اپنے فیصلے صادر کیے جائیں۔ ایسی اطاعت کو کوئی ذات قبول نہیں کر سکتی انسان جس حکومت کا شہری بن کر زندگی گذارنا چاہے اس پر اس کی اطاعت لازم ہوگی۔ کوئی حکومت ایسے شہری کو برداشت نہیں کر سکتی جسے شہری ہونے کی حیثیت سے تمام مراعات حاصل ہوں اور وہ کسی دوسری حکومت کے آئین وضوابط کا پابند ہو۔ مراعات ایک حکومت سے حاصل کرے اور کسی دوسری حکومت کی اطاعت کو لازمی جانے۔ ایسے شخص پر بغاوت کا مقدمہ قائم ہوگا، اور اس سے تمام مراعات چھین لی جائیں گی۔

مراعات کے حقدار صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جن کی سرشت

میں دفا ہو، جو حکومت کے مجوزہ قواعد و ضوابط کے پابند ہوں، اور ان کا صحیح معنوں میں احترام کرنا جانتے ہوں، مجوزہ آئین و قوانین کی اطاعت کے بغیر اطاعت کا مفہوم واضح نہیں ہو سکتا، جو شخص زبان سے اطاعت کا اقرار کرے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ حکومت کے آئین و قوانین کے خلاف پراپیگنڈے میں بھی مصروف رہے، انہیں ناقابلِ عمل ثابت کرنے کی کوشش کرے تو اسے کوئی حکومت برداشت نہیں کرے گی۔ خواہ وہ کتنی بھی وسیع القلب اور کشادہ ظرف کیوں نہ ہو، وسیع القلبی اور کشادہ ظرفی کا ہرگز یہ مفہوم نہیں، کہ کسی انسان کو ان نظریات کا مذاق اڑانے کی اجازت دے دی جائے، جو ریاست میں اساسی حیثیت رکھتے ہوں، جن پر ملک و قوم کی عظمت کا انحصار ہو، ایسی آزادی نہ کسی قوم نے کبھی کسی فرد کو دی ہے ورنہ ایسی آزادی کے بعد ریاست کا وجود قائم رہ سکتا ہے۔ سلامتی کی راہ یہ ہے کہ انسان کو جو نظریہ حیات پسند نہ ہو جسے وہ انسانی ترقی کی راہ میں حائل سمجھے، یہ چاہئے کہ اسے اپنے سے انسانی ارتقا رک جائے گا، انسانیت کو وہ فوز و فلاح حاصل نہ ہو سکے گی جسے معراجِ کمال کہا جا سکتا ہے تو اس سے واضح طور پر علیحدگی اختیار کر لے۔ یہ طریقِ کار تو انتہائی غلط اور غیر معقول ہے کہ انسان ایک نظام سے چمٹا بھی رہے، اس کا رکن بن کر فوائد و مراعات

بھی حاصل کرے اور اس کا مذاق بھی اڑائے۔

اسلام نفاق کو انتہائی خطرناک قرار دیتا ہے۔ اور اس سے بچنے کی تلقین کرتا ہے، وہ اپنی تعلیم کو جبراً کسی کے سر تھوپنے کی کوشش نہیں کرتا، اسے تو صرف ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جن کے دل مصدق ہوں جن کے دل ریب و شک کے لیے کوئی گنجائش نہ ہو جنہوں نے اسلام کو دینِ فطرت سمجھ کر قبول کیا ہو، اور اس کا ہر ضابطہ ان کے نزدیک دل ربائی کی حیثیت رکھتا ہو۔

منافقت سے نبرد ہر دل اگر ایک جگہ اکٹھے بھی ہو جائیں تو ان کی کوشش سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ پہاڑوں کو چیرنا، دریاؤں کو عبور کرنا اور صحراؤں کو بوستانوں میں تبدیل کر دینا، عزم راسخ کے معجزانہ کارنامے ہو سکتے ہیں، منافقوں نے کب کوئی میدان جیتا ہے، کب قربانیاں دی ہیں، کب تلواروں کی چھاؤں میں رقص کیا ہے؟ انہیں تو ہر وقت صرف اپنا ہی مفاد عزیز رہا ہے، کسی نظم کے ساتھ وہ صرف اسی وقت تک چل سکتے ہیں جب تک مفادات آندھی کے آموں کی طرح ان کی جھولی میں گرتے رہیں، جب بھی ایثار و قربانی کا وقت آئے، وہ بڑی صفائی سے الگ ہو جاتے ہیں، یہی ان کی تاریخ ہے، یہی ان کا معمول رہا ہے

طریقِ کار صدیق بن کر صدق کے فروغ وارتقا کے لیے میدان میں سربکف نکلنا صرف صدیق دلوں کا شیوہ ہوتا ہے اور اسلام کو ایسے ہی صدیقوں کی ضرورت ہے۔

حق کی نیابت

تبلیغ و ہدایت چونکہ انبیاء کی میراث ہے اس لیے انسان کو یہ فریضہ سرانجام دینے کیلئے پیمبرانہ صفات کا حامل ہونا چاہیئے۔ حکمت و تدبر اور للہیت کے جذبات سے عاری ہو کر جو لوگ یہ فریضہ سرانجام دیتے ہیں وہ تبلیغی مقصد کو فائدہ پہنچانے کی بجائے الٹا نقصان پہنچاتے ہیں۔ حق کی علمبرداری کی پہلی شرط بے غرضی، بے نفسی، حلم اور بردباری ہے۔ حق بات سننے والے کو جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حق گوئی کا محرک حق پرستی کا جذبہ ہے تو سننے والے کے دل پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ ایثار اور قربانی کے جذبات کلام کو تاثیر بخشتے ہیں۔ اور یہی جادو سامع کے دل کی دنیا بدل کر رکھ دیتا ہے۔ ایثار اور خلوص کے جذبات سے عاری کوئی خواہ کیسا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو۔ کسی دل میں انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔ صدق بھرے دل سے نکلا ہوا ایک جملہ بھی کئی دفتروں پہ بھاری ہوتا ہے۔ اس

سے شعور و احساس و شعور اثر لیتے ہیں۔ وجدان جھومتا ہے، اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے
جس شخص کی روح میں خود سوز نہ ہو وہ کسی دل میں کیا سوز پیدا کر سکے گا؟
اضطراب، اضطراب کا نتیجہ ہوتا ہے، سوز کو سوز جنم دیتا ہے۔ گداز کو خالق
روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز ہوتی ہے۔ روح کی تڑپ نے جب
بھی الفاظ کی صورت اختیار کی ہے وہ روحوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکی
اور شقاوت نے کسی شخص کے دل میں کبھی رحم و کرم کے جذبات پیدا نہیں
کئے۔ اسے ایثار و قربانی پر آمادہ نہیں کیا۔ قدمہ درجہ یہ انسان کبھی حق نقیب
نہیں بن سکتا۔ حق کے فروغ کا منصب اس کی دسترس سے باہر ہوتا ہے
یہ منصب انہی لوگوں کو ملتا ہے جن کی زندگی ایثار سے عبارت ہو جن
کا سینہ جذباتِ عالیہ سے معمور ہو۔

خدا تعالیٰ کی ذات خود کریم ہے، کریم انسان ہی اس کا نمائندہ بن
سکتا ہے۔ کسی غلط کار اور جذباتِ عالیہ سے محروم انسان کو کوئی شریف
انسان بھی اپنی نیابت کا فریضہ نہیں سونپتا، تو خدا سے یہ توقع کیسے کی جا
سکتی ہے؟ نائبینِ حق انتہائی بردبار، نفسانی خواہشات سے پاک اور حلیم
و کریم ہوتے ہیں۔ یہ پیغمبروں کے فرائضِ حیات میں ہوتی ہے کہ گالی کا جواب
نیکی سے دیں، تشدد برداشت کریں اور جو لوگ راہ گم کر چکے ہوں انہیں
راہ دکھائیں۔

روحانی امراض

بسا اوقات ایک معمولی حادثہ انسان کی زندگی میں عظیم انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ جو سعادتیں جد و جہد سے حاصل نہیں کی جا سکتیں ایک ٹھوکر ان سے واصل کر دیتی ہے۔ ٹھوکر ایک حساس انسان کے لیے بیداری کا پیغام ثابت ہوتی ہے خواہ وہ کتنی بھی خفیف کیوں نہ ہو۔ انسان حساس کی دولت سے محروم ہو تو اسے شدید جھٹکے بھی بیدار نہیں کر سکتے۔ غافل انسان پریشانیوں میں مضطرب تو ہوتا ہے، آفات سماویہ کا شکوہ تو کرتا ہے لیکن محرکات پر غور نہیں کرتا جن کا یہ لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ جو انسان درد کی شکایت کرے اور طبیب کی طرف رجوع نہ کرے، دنیا اسے دیوانہ سمجھتی ہے ایسے ہی جو شخص بد اعمالیوں کے اثرات سے کراہ رہا ہو۔ اس کی حیات کا ہر لمحہ سکون کی دولت سے محروم ہو گھر میں عیش و عشرت کے سامان موجود ہوں۔ مگر وہ سکون کو ترس رہا ہو تو اسے اس طبیب حاذق کا بتلایا ہوا نسخہ استعمال کرنا چاہیے جس کا پیغام شفا ہے جو مردہ دلوں کو دوبارہ زندگی عطا کر سکتا ہے۔ کوئی سکون کا طالب بن کر آئے تو سہی

سکون ملتا ہے۔ روحانی کیف و سرور اور مستی کی طلب ہو تو اس کی بارگاہ سے یہ جنس بھی طلب سے سوا ملتی ہے بشرطیکہ طلب خام نہ ہو۔

دنیا کے بازار میں کھوٹے سکے کام نہیں دیتے اور اس بارگاہ میں یقین کا کھوٹ قبول نہیں۔ یقین کی پونجی دامن میں ہو تو فائزِ منزل بنا کر رہتی ہے۔ احساس کی بیداری ان راستوں کو ہموار کر دیتی ہے جو ناقابلِ عبور نظر آتے ہیں۔ بیداری بھی وہی کر سکتا ہے جس کا احساس زندہ ہو اور بیداری بھی اسی کو نصیب ہو سکتی ہے جس کے احساسات میں زندگی کی رمق موجود ہو۔ احساس ہی مردہ ہو تو بیداری کیسی؟ دل زندہ کرنے کی یوں ہی تاکید نہیں کی گئی۔ جسم توانا ہو تو عوارض کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ جسمانی صحت ان کا مقابلہ کر کے انہیں نیست و نابود کر دیتی ہے۔ ایسے ہی دل زندہ ہو تو روحانی عوارض غالب نہیں آ سکتے۔

دل کی زندگی باطنی صحت کی ضامن ہوتی ہے۔ گونا گوں امراض کی آماجگاہ بالعموم وہی جسم بنتا ہے جس کی صحت میں بنیادی طور پر کوئی نقص ہو۔ دل بھی صحت سے محروم ہو تو گونا گوں بیماریوں کا شکار بن جاتا ہے۔ روحانی اضطراب بھی بیماری ہے اسے صحت کی علامت نہیں کہا جا سکتا۔ صحت سکون کی ضامن ہوتی ہے خواہ جسمانی ہو یا روحانی۔

صحابہؓ کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ جسمانی عوارض سے پاک تھے۔ عوارض ان پر بھی اثر انداز ہوتے تھے۔ بیماریاں ان پر بھی غلبہ کرتی تھیں، لیکن یہ بات پورے وثوق اور اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ روحانی عوارض انہیں کبھی مغلوب نہیں کر سکے خطرناک سے خطرناک موقع پر ان کا خدا سے کبھی اعتماد نہیں اٹھا۔ خدا تعالیٰ سے ہٹ کر ان کی نظریں کبھی غیر پر مرکوز نہیں ہوئیں۔ جو مشکل انہیں پیش آئی ہے، انھوں نے اسے اپنی شامتِ اعمال کا نتیجہ قرار دے کر اپنے اعمال کی درستگی کی طرف توجہ دی ہے، اور ہم ہر ناگواری کو یوں محسوس کرتے ہیں، گویا خدا تعالیٰ نعوذ باللہ ہمارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ہمارے اعمال تو سراسر خیر ہی خیر تھے یہ ناگواری کہاں سے ٹپک پڑی ؟

بد پرہیز اور حفظانِ صحت کے اصولوں کو نظر انداز کر دینے والا انسان جب بھی بیمار ہوتا ہے اور اس کے پیٹ میں درد اٹھنے لگتا ہے تو وہ اپنی بد پرہیزی کا اعتراف کرنے کی بجائے بالعموم بیماری کو ایک ناگہانی حادثہ قرار دینے لگتا ہے۔ کبھی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ اس نے بھی کوئی غلطی کی ہے۔ جس انسان کی زندگی ایک ضابطے کے تحت گزر رہی ہو، وہ علالت کو بے احتیاطی کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ روحانی مریض بھی اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتے اسے حادثہ قرار دیتے ہیں اور خدا کے نیک بندوں کو کوئی اضطراب

لاحق ہوتا ہے تو وہ اپنا قصور جان کر توبہ کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

تعلق باللہ

نیت اگر بخیر ہو تو عمل کی کوتاہی بھی قبول ہو جاتی ہے۔ نیت کے بغیر اچھے سے اچھے عمل کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ جس سکے پر سرکاری مہر نہ ہو وہ مصنوعی کہلاتا ہے۔ اس کی بازار میں کوئی قیمت نہیں پڑتی۔ سرکاری مہر والا سکہ چل جاتا ہے خواہ کھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ تھوڑی بہت قیمت تو اس کی مل ہی جاتی ہے۔ درخت کی جڑیں گر زمین سے اکھڑ چکی ہوں تو اس کی شاخیں زیادہ دیر تک سرسبز و شاداب نہیں رہ سکتیں۔ ان کی بہار عارضی اور وقتی ہوتی ہے۔ زمین سے رشتہ قائم رکھنے والا درخت پھلوں اور پھولوں سے محروم بھی ہو تو وقت آنے پر پھل پھول سے معمور ہو کر رہتا ہے۔ لیکن بہار صرف اسی درخت کے حصے میں ہوتی ہے جس کا زمین سے رشتہ استوار ہے۔ جس کی شاخیں کٹ جانے کے بعد زمین سے غذا اس کی رگ رگ کو پہنچتی ہے جب ریشے ریشے میں پہنچتی ہے تو وہ مرجھایا سا درخت سرسبز ہونے کی امید قطع نہیں ہوتی۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس درخت

برسنے لگتا ہے سوکھی شاخوں کو تازگی عطا ہوتی ہے نئی کونپلیں نکلتی ہیں، جہاں ویرانیوں کا ڈیرہ ہوتا ہے وہاں نئی بہاریں مسکراتی نظر آنے لگتی ہیں اور پھلوں سے درخت کا دامن بھر جاتا ہے۔ ایک ایک شاخ سرمستی و نشاط کے عالم میں جھومنے لگتی ہے۔

یہ سب فیضان درخت کے اس استحکام کا نتیجہ ہوتا ہے جو اسے محرومیوں کے باوجود زمین سے حاصل رہتا ہے۔ زمین سے رشتہ منقطع کر لینے کے بعد درخت کے سرسبز و شاداب ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

حیات کا دامن بھی شادابیوں سے اسی وقت بھر سکتا ہے جب پھلوں اور پھولوں سے محرومی اور زندگی کے اثمار سے تہی دامنی کے باوصف انسان کا اپنے مولا سے تعلق نہ ٹوٹنے پائے۔ اس کے دل پر یاس کا غلبہ نہ ہو۔ احساس یہی رہے کہ بادل اب برسے، بس مست گھٹاؤں کے اٹھنے کی دیر ہے۔ اب کے برسیں تو ماضی کی تمام محرومیوں کی تلافی ہو جائے گی۔

اپنے رب سے ایسا تعلق قائم کر لینے والا انسان کبھی محروم نہیں رہتا۔ بادل آتے ہیں، اور برستے ہیں، رحمت کی گھٹائیں اٹھتی اور محرومیوں کو مٹا کر رکھ دیتی ہیں۔ مینہہ برستا ہے تو گرد آلود پتوں کا منہ دھل جاتا

جب خدا کی رحمت کا مینہ برسنے لگتا ہے تو حیات کا سارا گرد و غبار دھل جاتا ہے انسان کے چہرے پر آلام کی گرد باقی نہیں رہتی۔

ماتم مصائب و آلام کا نہیں ہونا چاہیے۔ اس عدم تعلق پر خون کے آنسو بہانے کی ضرورت ہوتی ہے جو بندے اور مولا کو جدا کر دے۔

قابلِ ماتم جدائی ہوتی ہے، وصال نہیں، وصال کی کیفیتیں بھی جدائی کی راتوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ جس کی یاد سے سینہ معمور ہو، رگ رگ میں اس کی پرستش ہو، جس کے جمال کا تصور روح کو تازگی عطا کر رہا ہو، دل میں جذبات کے نئے نئے طوفان اٹھ رہے ہوں اور اشکوں کی رم جھم میں اس کے جمال کی رعنائیاں نظر آ رہی ہوں، وہ دور کہاں ہوتا ہے؟ وہ تو شہ رگ سے بھی نزدیک ہوتا ہے۔ دوری تو اس ذات سے متصور کی جا سکتی ہے جس کی یاد بھولے سے بھی نہ آسکے، یاد آئے بھی تو کوئی مزا نہ دے۔

مزا تعلق کی علامت ہوتا ہے۔ بے مزہ یاد کو بھی تعلق کی علامت کہا جا سکتا ہے؟

تعلق وہ فیضانِ کیف و سرور ہوتا ہے اور بے تعلقی کا بے کیفی۔ اس سے بندہ مولا سے اپنے تعلق اور عدمِ تعلق کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

خشیتِ ربانی

مومن کو ہر مقام پر خدا سے ڈرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ حالات خواہ کیسے بھی کیوں نہ ہوں، اسے یہی تاکید کی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ اسی سے استعانت طلب کرے اور اسی کے بتائے ہوئے رستے پر گامزن ہو رہے۔ خدا کی راہ میں جو ہزیمتیں پیش آئیں اسلام کی نگاہ میں وہ ان کامیابیوں پر فضیلت رکھتی ہیں جو ایک انسان کو شیطان کی راہ پر چل کر حاصل ہو سکتی ہیں قرآن ان تمام انسانوں کی زندگی کو ناکام قرار دیتا ہے جو خوش حال ہونے کے باوجود زبانِ ہدایت سے محروم تھے اور اس کے مقابلے ان انسانوں کو فائز المرام بتاتا ہے جن کی زندگی بظاہر گزشتہ مفلس اور فاقہ کش ہونے کے باوصف مشیتِ ربانی کے تابع تھی۔ دنیوی تذکروں کے مطابق شداد وہامان اور فرعون کامیاب تھے۔ لیکن خدا کی نظر میں وہ جہنمی ناکامیاب ترین ہستیاں ہیں روحانی کامیاب ہستی ہے۔ جو خدا کو اپنا محور و مرکز بنا کر اسی کے حکموں کے لیے زندگی کی بازی لگا دیتا ہے۔ اغراض و بد

نہیں ہو سکتا۔ نفس کی اطاعت اور خدا کی اطاعت دو متضاد چیزیں ہیں
ایک کے لیے دوسری کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ طاغوت سے رشتہ جوڑ کر انسان
خدا کا بندہ نہیں ہو سکتا۔ بہت بڑا فرق ہے۔ بشری فروگذاشتوں میں
اور طاغوت کی بندگی میں خدا کے بندے سے جب کبھی معصیت کا صدور
ہوتا ہے تو وہ احساس کی آگ میں اس قدر پگھلتا ہے۔ اس قدر نادم اور
شرمندہ ہوتا ہے کہ یہی ندامت اسے بارگاہِ صمدیت سے قریب کر دیتی
ہے۔ گناہوں کی گرد کو معصیت کے آنسو دھو ڈالتے ہیں گرد دھل جانے
کے بعد ایمان کے چہرے پر جو نکھار آجاتا ہے۔ اس پر رحمتِ باری نثار
ہونے لگتی ہے۔ طاغوت کے بندے کو یہ سعادت نصیب نہیں ہو سکتی
گناہ کی شقاوت کو اور بھیانک بنا دیتے ہیں۔ وہ گناہوں پر اتراتا
ہے فخر کرتا ہے اور مزید گناہوں کا ارتکاب کرنے کے لیے نئی نئی راہیں
ڈھونڈنے میں مصروف ہو جاتا ہے جس گناہ کے ارتکاب کے بعد دل
میں خدا کا خوف پیدا ہو جائے۔ نیناں سے چھم چھم آنسو برسنے لگیں اور
احساس کی آگ توبہ کے دروازے پر لے آئے۔ وہ مبارک ہے۔ دروازہ
پر پہنچنے کے بعد یا تو مومن دروازہ کھلنے کی امید ہو جاتی ہے شکستگی سے۔
اعترافات کے ساتھ آنے والوں کے لیے آخر کون دروازہ بند رکھتا
ہے۔ غیظ و غضب کی آگ کو آنکھوں سے گرنے والا ندامت کا ایک آنسو

بھی ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ اس صحابیؓ پہ اللہ کی لاکھ لاکھ رحمتیں ہوں جو رحمت کا اداشناس تھا۔ جس کا معمول یہ تھا کہ خدا کی محبت میں جو آنسو گرتا وہ اسے ضائع نہ ہونے دیتا۔ چہرے اور بدن پر مل لیتا۔ ایک استفسار کے جواب میں خدا کے اس مقبول بندے نے کہا کہ میں نے رحمت کامل صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ خدا کے خوف میں گرنے والا آنسو بدن کے جس حصے پر لگے گا اس پر جہنم کی آگ، انشاءاللہ نہ جلے گی۔

یہیں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جن آنکھوں کو خدا کی یاد میں رونے کی سعادت نصیب ہے، جو دل عشق الٰہی میں تڑپنے کے خوگر ہیں خدا کے نزدیک ان کی کیا قدر و منزلت ہے؟

جہاں پہ خون ہو کر دل نگاہوں سے ٹپکتا ہے
وہیں محوِ عبادت بندگی محسوس ہوتی ہے

اعترافِ عبودیّت

انسان اپنی عقل و فکر کے تمام تر دعووں کے باوجود قدرت کے ان سربستہ رازوں کو معلوم کرنے سے قاصر ہے جن کے متعلق خانۂ غیب سے ہے۔ عالمِ غیب کی حقیقتوں کو معلوم کر لینا تو خیر بڑی بعد کی بات ہے

ابھی تک یہ خاک زادوں کا پتلا عالمِ شہود کے اسرار بھی معلوم نہیں کر سکا، برق و بخارات کی دنیا پر قابو یاب ہونے کے بعد ابھی تک یہ لامحدود وسعتوں میں پھیلی ہوئی کائنات کے ایک حقیر ذرے کی تھوڑی سی حقیقت معلوم کر سکا ہے اور اسے ایٹمی قوت کا نام دے کر نازاں و فرحاں ہے نہ جانے ابھی کتنی حقیقتیں اس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ وہ عالمِ آخرت کی دریافت کرنے تک ان کا سراغ لگانے میں کہاں تک کامیاب ہو سکے گا۔

انسان دنیا میں نائبِ حق ہے اور نیابت کے فرائض سرانجام دینے کے لیے جو بھی صلاحیتیں درکار ہو سکتی ہیں ان کے عطا کرنے میں قدرت نے نہایت فیاضی سے کام لیا ہے لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ یہ فنا پذیر قوتوں کا مالک قدرت کی لازوال اور باقی رہنے والی حکمتوں کا حریف و مقابل بھی بن سکتا ہے۔ گدا کو خواہ کتنی ہی نعمتوں سے نوازا جائے وہ بہ حال گدا ہی رہے گا۔ اس کا یہ دعویٰ درست نہیں ہو سکتا کہ وہ شاہ کے خزانوں کی حقیقت و ماہیت سے پوری طرح آگاہ ہو چکا ہے۔ اس کے تمام سربستہ رازوں کو اس نے پا لیا ہے اور اب کوئی حقیقت باقی نہیں رہی جو تحقیق سے پوری طرح بیان نہ کر لیا ہو۔ اس قسم کے دعوے ہی شانِ گدائی کے منافی ہوتے ہیں۔ گدا شود

کا قرب حاصل کرنے کے بعد اور اس کے مزاج میں دخل پا لینے کے باوصف بھی گدا ہی رہتا ہے۔ بخشش و نوازش سعادت مند گدا کو شکر کے مقام پر فائز کر دیتی ہے۔ اسے تو گدائی کے شکر ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ وہ شاہ کا مثیل و مماثل بننے کے خیالات کو دل میں کہاں جگہ دے سکتا ہے۔ مگر رذیل انسان کی فطرت یہ ہوتی ہے کہ اس پر جب بخشش و رحمت کے دروازے کھلتے ہیں تو اس کی عقل میں فتور آنے لگتا ہے۔ وہ اپنی حقیقت بھول کر آقا سے ہمسری کا دعوےٰ کرنے لگتا ہے۔ فطرت اگر سعید ہو، ذہن و ضمیر اگر پاک ہوں تو قرب کا ہر مرحلہ عرفانِ ذات سے شناسا کر دیتا ہے۔ وہی عرفان اسے مزید قرب کا حق دار بنا دیتا ہے۔ جو عطا انسان کو معرفت شناسی کے لئے تیار کرنے کی بجائے اپنی ہی ذات کے محاسن کے حسن و جمال میں الجھا دے وہ بلا ہوتی ہے جو بندے کو خدا کی بارگاہ سے بہت دور پھینک دیتی ہے۔ عطا وہی انعام و کرم کہلا سکتی ہے جو انسان کی آنکھوں سے غفلت کے پردے ہٹا دے اور اسے منعم کی مزید معرفت کا حق دار بنا دے۔

حضورؐ نے [illegible] معرفتِ ربانیہ کی [illegible] کے باوجود بھی ہمیشہ یہی فرمایا [illegible] کہ میں معرفت [illegible] نہیں کر سکا، جیسے اس کا حق تھا۔ یہ اعتراف [illegible] بھی۔

دلیل ہے، ان دونوں قوتوں کی مالک و مختار ذات کی۔ بلکہ یہ ان ہی لوگوں کا شاخسانہ و مرتبہ ہے جو اعتراف عبودیت کرتے ہیں۔ کیونکہ جو بندہ کی فطرت ربی ہو۔ وہ دنیا کو جو لوگ عقل و دانش کی کل کائنات سمجھ کر ربانی قوانین پر حرف گیری کرنے لگتے ہیں، ان کا انجام ابلیس سے مختلف نہیں ہوتا۔ آخر ابلیس کا گمان بھی تو یہی تھا کہ آدم کے سجدے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ عقل کی میزان پر پورا نہیں اترتا۔

جمال کی لذتیں

نعمت کی موجودگی میں بہت کم لوگوں کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، ورنہ بالعموم نعمت کے زوال کے بعد ہی اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ مرض شدت اختیار کرے تو صحت یاد آنے لگتی ہے۔ جوانی کی پُرکیف بہاریں گزر جائیں اور ان کی جگہ بڑھاپے کے سائے منڈلانے لگیں، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا مشکل ہو جائے، معدہ غذا ہضم کرنے سے انکار کر دے، تازہ خون پیدا نہ ہو، اور دل میں نشاط کے جذبات کی تخلیق کی بجائے غم و آلام کے جذبات پیدا ہونے لگیں تو جوانی کا ہر لمحہ یاد آنے لگتا ہے۔ جو کبھی سرور انگیز اور نشاط خیز ہوا کرتا تھا

زندگی عبارت تھی۔ قدرت کا قانون یہی ہے کہ گذرے لمحے واپس نہیں
آتے۔ ان کی یاد باقی رہ جاتی ہے جو دل میں تیر و نشتر بن کر کھٹکتی رہتی
ہے۔ کسی گمراہ مسافر کو اپنا سب کچھ ضائع کرنے کے بعد بھی اگر حسرت
زیاں ہو جائے اور وہ دوری منزل کے احساس سے مضطرب ہونے
لگے۔ تو بسا اوقات اس پر زندگی کی راہیں کشادہ ہو جاتی ہیں۔ کشادگی
پیدا کرنے والی چیز احساس کی شدت اور دوری منزل کا احساس ہوتا
ہے جو مسافر حیات کی پونجی لٹ دینے کے بعد بھی وقت سے بہرہ ور
ہو جائے۔ وہ محروم نہیں ہوتا منزلیں خود اس کے استقبال کے لیے
آتی ہیں۔ راہیں اس کے لیے کشادہ ہوتی ہیں اور غیب سے اس کی مدد
کے سامان پیدا ہوتے ہیں۔ یہ عالم شہود ہی ایک عالم نہیں، بہت
سے نادیدہ عالم ہمارے اندر اور باہر موجود ہیں جن کی کنہ و حقیقت
کو ابھی تک نہ تو ہماری آنکھیں دیکھ سکی ہے اور نہ ہی ہماری عقل نہیں پا سکی۔ ایسے ان گنت
جہان ہمارے حواس کی دسترس سے باہر ہیں۔ ظاہر کو ظاہر پا سکتا ہے وہ
باطن کو باطنی حواس کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ انسان ظاہری
حواس ہی کا مجموعہ نہیں۔ اس کے اندر کئی نادیدہ جہان ہیں، کئی
مستور اور چھپی ہوئی کیفیتیں اور جذبے ہیں، احساسات و جذبات
کے کئی ناپیدا کنار سمندر ہیں، جو ہیبتناک و خوف کے نیچے دبی

دنیا میں چھپے ہوئے ہیں باطن کا آئینہ جب مجلّیٰ اور روشن ہوجاتا ہے تو اس میں کئی چھپی ہوئی حقیقتوں کا عکس پڑنے لگتا ہے۔ پھر انسان کو وہ حقیقتیں واضح طور پر دکھائی دینے لگتی ہیں جنہیں اس کی نگاہوں نے کبھی نہیں دیکھا ہوتا، اور نہ ہی ان کا دھندلا سا تصور اس کے وہم و گمان میں آسکتا ہے

انبیاء کے حواس کا مسئلہ ظاہری دنیا تک ہی محدود نہ تھا، انہیں ایسی قوتیں بھی عطا کی گئی تھیں جو ظاہر حواس پر فوقیت رکھتی تھیں انبیاء دل کے کانوں سے سنتے تھے، باطنی نگاہوں سے دیکھتے تھے، وہ کائنات میں ان کی جو قوت متصرف تھی، وہ ظاہری قوت نہ تھی بلکہ وہ خدا داد باطنی قوت تھی جو انہیں نبی کی حیثیت سے عطا کی گئی تھی۔ انبیاء کا [illegible] محفل میں موجود ہونے کے باوجود [illegible] کے ذریعے حق [illegible] آواز سن لینا اور چھپے ہوئے رازوں کو معلوم کر لینا اسی باطنی قوت کا نتیجہ تھا۔ ورنہ ظاہر بات ہے کہ دوسرے لوگ بھی وہاں موجود ہوتے تھے جو نہ رب تعالیٰ کے قاصد جبرئیل کو دیکھ سکتے تھے، اور نہ ہی اس کی آواز سن سکتے تھے۔ یہ دیکھنا اور سننا باطنی حواس سے تھا۔ باطنی حواس کی قوت روشن کی [illegible] ہے۔ براہ راست انبیاء کی وساطت [illegible] یہ [illegible] اسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہے۔ جب انسان انبیاء کے

بتائے ہوئے طریقوں پر گامزن ہو سرکش اور باغی انسان کسی حکومت کے راز معلوم نہیں کر سکتا، ایسے ہی دل کے آئینے کو معصیت کی گرد سے خراب کر لینے والے لوگ مشاہدۂ جمال کی لذت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے، روحانی لذتیں ایمانِ کامل کا نتیجہ ہوتی ہیں، اور یہ بارگاہِ جمال سے صرف ان ہی لوگوں کو ملتی ہیں جو گناہوں کی کثافتوں سے دور رہ کر جمال کی لطافت سے رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔

مختلف راستے اور مختلف منزلیں

خدا کی راہ میں پیش آنے والی ہزیمتوں اور شکستوں کو بھی مردانِ حق اس خیال سے عزیز جانتے ہیں کہ یہ اختیاری نہیں۔ اصل چیز حق کے غلبے کے لیے جد وجہد تھی اور یہ انہیں حاصل ہے۔ خدا کی راہ میں پیش آنے والی ناکامی کو وہ اس کامیابی سے بہتر سمجھتے ہیں جو نفس کی اتباع میں حاصل ہو۔

اصل چیز کامیابی یا ناکامی نہیں وہ کوشش ہے جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہو! اہلِ حق کی جدوجہد کا مقصود چونکہ ذاتی خواہشات نہیں ہوتا ہے، اس لیے ناکامیوں سے دوچار ہونے

کے بعد اس کے جذبات پر اوس پڑ جاتی ہے اور وہ انتہائی رنجیدہ اور کبیدہ خاطر نظر آنے لگتا ہے۔ مومن کی جد و جہد کا مقصود اتنا اعلیٰ اور ارفع ہوتا ہے کہ نفسانی خواہشات کی گرد اس کی دل آویزیوں کے آئینے کو دھندلا نہیں سکتی اس لیے وہاں رنج و ملال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مومن اپنا سب کچھ نثار کرنے کے بعد بھی فرحاں و شاداں نظر آتا ہے اور کافر اس راہ میں معمولی سی چوٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

اس کی مثال دینے کے لیے ہمیں زیادہ کد و کاوش کی ضرورت نہیں، اسلام کے اندر اس کی ان گنت مثالیں موجود ہیں۔ کفر و اسلام کے پہلے معرکہ ہی کو دیکھ لیجیے جو بدر کے نام سے موسوم ہے۔ نقصان یہاں کافروں کا بھی ہوا اور مسلمانوں کا بھی، لیکن معرکہ بدر کی بعد کی تاریخ کو ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں مکہ میں صفِ ماتم بچھی ہوئی نظر آتی ہے اور ان لوگوں کی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی چیخوں کا شور سنائی دیتا ہے جو بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ لیکن اس کے برعکس مدینہ کا حال یکسر مختلف نظر آتا ہے، یہاں شہداء کے ورثاء مطمئن نظر آتے ہیں۔ ماتم اور شور و شیون تو ایک طرف رہا کسی کے چہرے پر ملال کے آثار نظر نہیں آتے، بلکہ اس احساس سے چہرے شگفتہ ہیں کہ ان کے شہداء کا خون اس مسلک کا [illegible] معرکہ بدر کے بعد کی تاریخ آپ کو نوحوں، مرثیوں، ولولوں، چیخوں اور آہوں کراہوں کی

تاریخ نظر آئے گی، لیکن تلاش و کوشش کے بعد بھی مدینہ کی کوئی ایسی خاتون نہ مل سکے گی جس نے اپنے کسی شہید کا مرثیہ لکھا ہو اور اس میں اس احساس کا اظہار کیا گیا ہو، کہ اسے بدر میں موت کیوں آئی؟ مسلمان خواتین اپنے شہیدوں کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتی ہیں اور کافر عورتیں اپنے مقتولین کے غم میں گھل گھل کر زندگی برباد کر رہی تھیں۔

کامیابی اور ناکامی کا جو تصور اسلام نے دیا ہے وہ مادی دنیا کے تصور سے یکسر مختلف ہے یہاں کامیابیوں اور ناکامیوں کا اندازہ مومن کے عزم و ارادے سے لگایا جاتا ہے۔ اگر اس کا عزم بلند ہے۔ جذبات کے سمندر کی سطح پر موج در موج طوفان اٹھ رہے ہیں تو وہ ہر حال میں کامیاب ہے۔ کامیابی کی دلیل ان عزائم کو سمجھا جائے گا جنہوں نے اسے مہیب طوفانوں کی ہولناکیوں سے بے نیاز کر دیا ہو کافر کو یہ سعادت نصیب نہیں ہو سکتی وہ خطرات میں کودنے سے پیشتر سو بار حالات کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جب ہر طرح سے اطمینان حاصل کر لیتا ہے کہ اب کوئی خطرہ نہیں، تو جد و جہد کا آغاز کرتا ہے۔

کافر اور مومن کی زندگی میں یہ بنیادی فرق اس لیے ہے کہ کافر کی زندگی کا مقصود دنیوی لذات کے سوا کچھ نہیں۔ اور مومن کے نزدیک اصل حقیقتیں وہ ہیں جو اسے اخروی زندگی میں نصیب ہوں گی۔

حق اخروی زندگی کی راحتوں کے حصول کا واحد ذریعہ ہے اور اس کے بغیر مومن کی زندگی کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ تمام راحتیں میسر ہونے کے باوجود بھی اگر کوئی اسلام کی سربلندی کے لیے کوشش نہیں کرتا تو وہ ناکام ہے۔ اور اگر مفلسی میں بھی اس کی تگ و دو کا سلسلہ جاری ہے تو وہ کامیاب ہے۔

خالد کی سرگذشت

دل احساس کی دولت سے محروم نہ ہو، تو دل کو زندگی ملتی ہے۔ اور اس منزل کا سراغ بھی جو حیات کی منزل ہے۔ ہدایت، احساس کی بیداری کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ احساس کے نشتر غافل کو بیدار اور گمراہ کو منزل رسید بنا کے چھوڑتے ہیں۔ معصیت سے آلودہ انسان جس کا احساس زندہ ہو ایک نہ ایک دن ہدایت پا کر رہتا ہے۔ گناہ کی زندگی میں اس کا قلب مطمئن نہیں ہوتا اس کا ضمیر ملامت کرتا ہے اور یہی ندامت اسے ہدایت کی طرف لے آتی ہے۔

اسلام کے ایک عظیم فرزند خالدؓ بن ولید نے اسلام لانے کے بعد اپنے جن جذبات و تاثرات کا اظہار کیا ہے ان سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گمراہی کی زندگی میں ان کا قلب مطمئن نہ تھا۔ خود

فرماتے ہیں کہ اسلام کے حریف کی حیثیت سے میں جس معرکے میں بھی شریک ہوا ہوں میں نے کفر کے پرچم کے نیچے کھڑے ہو کر جس شجاعت و بہادری کا بھی مظاہرہ کیا ہے اس سے میری روح کو شدید اذیت ہوئی ہے خلوت میں جب بھی بیٹھا ہوں، دل کی دنیا میں جب بھی جھانک کر دیکھا ہے خود کو اضطراب کے طوفانوں میں گھرا ہوا پایا ہے۔ دل نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ تو نے خداداد صلاحیتوں کو غلط استعمال کیا ہے۔ یہ صلاحیت خدا تعالیٰ کے دین کی نصرت و حمایت کیلئے صرف ہونی چاہیے تھی۔ آخر احساس کی یہی بیداری میری رہنما بن گئی۔ اور مجھے ظلمت کے حلقوں سے کھینچ کر اسلام نور کی آغوش میں لے آئی جو سرمدی ہے جس کا ہر جلوہ نظر فریب، جاں نواز ہے۔ یوں تو یہ احساس ہمیشہ سے موجود تھا لیکن مکہ میں عمرہ کی شکل میں حضورؐ کا ورود میرے لیے ایک نئی صبح کا پیغام ثابت ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ مکہ میں حضورؐ کی قیادت میں مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر قریش کے وہ بہادر مکہ چھوڑ گئے تھے جن کے دل میں اسلام کا شدید بغض تھا۔ قریش اور مسلمانوں میں صلح کی شرائط طے ہو جانے کے بعد مسلمان مکہ میں آنے کے مجاز تھے، اور آئینی لحاظ سے انہیں روکا نہیں جا سکتا تھا۔ میرا تعلق بھی قریش کے ان نوجوانوں سے تھا جو مسلمانوں کو کعبہ کا طواف کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ عمرہ

کے ایام میں، میں بھی مکہ چھوڑ گیا۔ میرا بھائی ولید جو مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا، وہ بھی عمرہ کی غرض سے مسلمانوں کے ساتھ آیا اور اس نے میری تلاش کی آنحضور علیہ السلام نے اس سے میرے متعلق استفسار کیا تو اس نے کہا کہ خالد بھی مکہ چھوڑ گیا ہے وہ مسلمانوں کو دیکھ نہیں سکتا۔ یہ سن کر حضور کو قلق ہوا اور حضور نے فرمایا کہ خالد جیسے ذہین انسان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ زیادہ دیر تک اسلام سے دور رہے گا۔ آنحضور نے ذاتی شفقت کی بنا پر یہ بھی فرمایا کہ خالد اگر میرے پاس آجاتا تو میں اس کے شایان شان سلوک کرتا۔

میرے بھائی ولید نے حضور کے یہ تاثرات سن کر مجھے ایک خط لکھا جس کا ایک ایک لفظ احساس میں ڈوبا ہوا تھا۔ خط کیا تھا میری حیات کا ضامن، میری مسرتوں کا امین جس نے میرے احساسات کا تار تار ہلا دیا۔ ظلمتوں سے نکال کر مجھے نور کی دنیا میں لے آیا جس کے جلووں کے لیے میری روح ازل سے بے تاب تھی۔ ولید نے لکھا تھا کہ حضور تمہارے منتظر ہیں۔ عقل کرو کس راہ پر گامزن ہو۔ یہ سعادت کی دولت جو ہم رسول خدا علیہ السلام کے قدموں میں ہم نثار ہو چکے ہیں۔ بہت سی سعادتیں تم کھو چکے ہو اب بھی وقت ہے حضور کے قدموں میں آ کر کھویا ہوا وقت حاصل کر سکتے ہو۔ مقام تہذیب ہو

کی غلامی بخشے گی کفر نے کیا دیا ہے؟ کفر کیا دے گا؟ کفر کیا دے سکتا ہے؟
حصول کی تمنا ہے تو آجاؤ، دروازے کھلے ہیں، راہیں کشادہ ہیں در
آغوشِ رحمت تمہاری منتظر ہے، جانتے ہو، تمہارا کس بے تابی سے
انتظار ہو رہا ہے۔ تمہیں کون یاد کر رہا ہے؟ وہ! جس کی تدبیروں کے
دل میں آرزو ہے جس کا خدا مشتاق ہے۔ بس آجاؤ، دیر نہ کرنا!"

ولید کے یہی الفاظ تھے جنہیں خالدؓ کی حیات کے دھارے کا منہ
موڑ کر رکھ دیا۔ اشتیاق کی دنیا بے تاب ہو گئی۔ شوق نے نئی کروٹ لی۔
عشق کو زندگی مل گئی۔ احساسات کے سمندر کی ہر لہر مچل کر وجدان کے
ساحل سے ٹکرانے لگی۔ آنکھوں نے آنسوؤں کے جو خزانے چھپا رکھے تھے
وہ سب بہہ نکلے۔ کفر کی راہ پہ گامزن ہونے والا جرنیل اب اسلام کی
راہ پہ گامزن تھا۔ شوق نے قرب و بُعد کے تمام مرحلے طے کر لیے۔ وہ
مکہ میں بیٹھ کر خود کو آغوشِ رحمت میں محسوس کر رہا تھا۔ رحمت اسے
لوریاں دے رہی تھی۔ دستِ شفقت آستین سے نکل کر اس کے آنسو
پونچھ رہا تھا اور آنسوؤں کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ اس کے ماضی کے
تمام گناہوں کو دھو کر اس کے دل کی دنیا کو منور کر رہا تھا۔ آخر خالدؓ
کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا وہ مدینہ میں عثمان بن طلحہ اور عمرو بن عاصؓ
کے ساتھ آیا تو تسکین بھی ملی۔ مدح و سرشاری بھی نصیب ہوئی۔ ماضی

کے گناہ بھی دُھل گئے، اور رحمتِ کاملہ نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

محدّث اور حدیث

ابوزرعہ محدّث کا انتقال ہوا تو وہ اپنے آبائی وطن رَے کی ایک نواحی بستی میں مقیم تھے۔ حدیث سے انہیں جو غیر معمولی شغف تھا اسی کے باعث وہ علمائے عصر کے محبوب بن چکے تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ ابوزرعہ کو چھ لاکھ حدیثیں یاد ہیں جواہرات کے متعلق جوہری ہی کی رائے معتبر ہو سکتی ہے۔ گھسیارے کی رائے قبول نہیں کی جا سکتی۔ ایسا نہ کیا جائے تو دنیا کا نظام قائم نہیں رہ سکتا بھینس یا گھوڑے کے لیے گھاس خریدتے وقت ہو سکتا ہے کہ ہم ایک گھسیارے کی رائے دریافت کر لیں لیکن جب ہم جوہری یا ڈاکٹر سے ہم کلام ہوں گے تو گھسیارے کے مشورے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔

علمِ حدیث کی خدمت میں جن لوگوں نے اپنی زندگی صرف کی ہے حدیث کے باب میں انہی کی رائے معتبر ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں اگر کسی منشی یا کلرک مشورہ دینے کی کوشش کرے تو اس کی حیثیت اس گھسیارے سے مختلف نہ ہوگی جو گھاس بیچتے بیچتے لعل و یاقوت کی باتیں کرنے لگا ہو

انتقال کے وقت ابو زرعہ کے پاس علماءِ محدثین کی جو جماعت تھی، اس کا تقویٰ مثالی حیثیت رکھتا تھا۔

حدیث کی روایت کرنے کے لیے تو دوسری اعلیٰ انسانی صفات سے متصف ہونے کے علاوہ اعلیٰ تقویٰ کی ضرورت بھی ہے، لیکن منکرِ حدیث بننے کے لیے کسی خوبی کی ضرورت نہیں، نہ زہد و تقویٰ کی، نہ اعلیٰ انسانی اقدار کی۔ جس شخص کو زندگی بھر حلال لقمہ نصیب نہ ہوا ہو، حرام مال خون بن کر رگوں میں دوڑ رہا ہو، اور زندگی بھر نئے نئے خداؤں کے آستانے کی خاک بوسی اس کا شعار بن چکا ہو۔ وہ بڑی بے تکلفی سے ان لوگوں کی بے لوث دینی خدمت کو عجمی سازش قرار دے سکتا ہے جن کی پاکبازی مسلمات کا درجہ رکھتی ہے، جن کی آنکھیں ساری رات اپنے رب کے حضور جھکی رہتی تھیں۔

> جن نفوسِ قدسیہ کو خدا تعالیٰ نے احادیثِ نبویہ کی ترتیب و تدوین اور نشر و اشاعت کی توفیق بخشی تھی، حدیث کی برکت سے انہیں وہ محبوبیت عنایت ہوئی تھی کہ ہر دور میں ان کا تقویٰ و ورع ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک رہا ہے۔ سوادِ اعظم نے ان کی غایت درجہ تعظیم کی ہے، چہ جائیکہ [illegible] ان کا زہد و تقویٰ مجروح،

نظر نہیں بن سکتا۔ آفتاب کو رشنیوں کی تائید کے بغیر بھی آفتاب
ہی رہتا ہے اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ابوزرعہ نزع
میں تھے، تو بعض علماء نے انہیں کلمہ پڑھنے کی ترغیب دینا
چاہی لیکن انہیں یہ حجاب مانع تھا کہ اتنے عظیم محدث اور
پاکباز انسان کو کیسے ترغیب دیں۔ طے یہ پایا کہ جس حدیث میں
آخری وقت کلمہ طیبہ پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے اسے پڑھنا شروع
کیا جائے ترغیب کی یہ اچھی صورت تھی چنانچہ حدیث کی روایت
ہمراہ سند پڑھنا شروع کی گئی ایک راوی پہ پہنچ کر پڑھنے والا
رکا تو ایک اور محدث نے روایت شروع کر دی۔ اتفاق سے
وہ بھی ایک راوی پہ پہنچ کر رک گیا اور ابوزرعہ نے روایت
شروع کر دی محدثین کہتے ہیں کہ از اول تا آخر وہ کہیں نہیں
رکے۔ حالانکہ ان پہ نزع کا عالم طاری تھا۔ حدیث سے
یہ شغف ان کے کامل ایمان کا نتیجہ تھا۔

آداب اور معاشرت

سلسلۂ چشتیہ کے مقتدا حضرت مودود چشتی کو جب دعوت و ارشاد کا منصب سونپا گیا تو ان کی عمر بہت کم تھی۔ یہ منصب ان کے والد ماجد حضرت ناصر الدین ابو یوسف چشتیؒ نے تفویض کیا تھا۔

حضرت مودود چشتیؒ عنفوانِ شباب ہی میں قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد علوم دینیہ کے متبحر عالم بن چکے تھے۔ عبادت و ریاضت کا یہ عالم تھا کہ قائم اللیل و صائم الدہر تھے۔ منہاج العارفین حضرت کی مشہور تصنیف ہے جو بزرگانِ سلف کے حالات پر مشتمل ہے یہ کتاب حضرت نے پندرہ سال کی عمر میں تصنیف کی تھی۔

زندگی کا تمام تر محور و مرکز چونکہ رضائے الٰہی بن چکا تھا۔ اس لیے حضرت اتباعِ شریعت کا غایت درجہ خیال رکھتے تھے۔ سلطانِ سنجر ملک شاہ اگرچہ آپ سے نہایت درجہ عقیدت رکھتا تھا لیکن کسی انسان نے آپ کو اس کی تعظیم و تکریم کے لیے کھڑے ہوتے نہیں دیکھا۔ آپ کی تمام شفقت و محبت غربا و مساکین کے لیے تھی اور ان کی انتہائی تعظیم کرتے تھے۔ حضرت کا معمول تھا کہ ہمیشہ سلام کہنے میں تقدیم کرتے۔ حضرت نے

مخدوم نے ایک دفعہ عرض کیا کہ آپ تمام معمولی آدمیوں کو پہلے سلام کہتے ہیں حالانکہ آپ کو سلام عرض کرنا ان کا حق ہے۔ چھوٹوں کو بڑوں کی تعظیم کرنی چاہیئے۔

حضرت نے جو ارشاد فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ محبت و شفقت حسب حد کمال کو پہنچ جاتی ہے تو دنیا کے بنائے ہوئے آئین و قوانین سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ اسے ہمیشہ پہل در محبت و شفقت کا اظہار کرنے میں مزا آتا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت نے ان لوگوں کی توجہ واقعہ معراج کی طرف مبذول کرائی اور فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج کی رات حریم جمال میں پہنچے تو پہلے اللہ تعالیٰ نے حضور کو سلام کہا تھا۔ السلام علیک ایھا النبی۔ اسی کی دلیل ہے یہ تو انسان کے بنائے ہوئے ضابطے ہیں کہ چھوٹا بڑے کو سلام کہے۔ چھوٹوں سے ایسی توقع رکھنے سے انسان میں کبر پیدا ہوتا ہے اور کبر انسانیت کے زوال کا باعث بنتا ہے۔ چھوٹوں سے اس طرح کی توقع رکھتے رکھتے جب انسان کی یہ عادت پختہ ہو جاتی ہے کہ میں بڑا ہوں چھوٹوں کو مجھے سلام کہنے میں پہل کرنی چاہیے تو پھر وہ بڑوں سے بھی یہی توقع کرنے لگتا ہے۔ صغیرہ گناہ پر اصرار انسان کو کبائر کا خوگر بنا دیتا ہے۔ معذرت کرنے کی عادت ڈال لی جائے تو خداوند کریم انسان کو کبائر سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔

یہی عاجزی اور فروتنی جو حضرت کا شعار تھی۔ ان کے عقیدت مندوں کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ بھی اپنے شیخ کی پیروی کرنے لگے۔ اسی فیضِ صحبت کا نتیجہ تھا کہ آپ کے خلیفہ حضرت شریف زندنی عجز و انکسار کا پیکر بن گئے۔ غایت درجے کی عظمتوں کے حصول کے بعد بھی ان کا یہ معمول تھا کہ جب بھی کوئی افلاس زدہ اور پھٹے کپڑوں میں ملبوس فقیر آپ کے پاس آتا تو اس کے سامنے غایت درجہ عجز و انکسار کا اظہار کرتے۔ آبدیدہ ہو کر فرماتے کہ الٰہی اس غریب اور مسکین کو صراطِ مستقیم پر استقامت عطا فرما۔ ہر مسکین کو پہلے سلام کہنا شریف زندنی کا معمول تھا اور یہ طریقہ انہوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت مودود چشتیؒ سے اخذ کیا تھا۔

انسان کے پیشِ نظر جب حضور خیر الانامؐ کا اسوۂ حسنہ ہو تو اس کے بھٹکنے اور گمراہ ہونے کے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ گمراہیاں اور ظلمتیں وہیں پر پھیلتی ہیں، جہاں آفتاب کا نور نہ ہو۔ آفتاب سے زمین پر چلنے والے مسافر ٹھوکروں سے محفوظ رہتے ہیں۔ انہیں گڑھوں میں گر کر ہلاک ہونے کا خطرہ نہیں رہتا۔

اہلِ مدینہ کو حضور علیہ السلام نے ابتدائی باتیں جو تعلیم دی تھیں۔ ان میں معاشرت کے اصول بھی تھے۔ حضور نے فرمایا تھا کہ ایک دوسرے کو سلام کہا کرو، کھانا کھلایا کرو اور رات کے اس حصے میں عبادت کیا کرو۔

لوگ سوجائیں۔ اہل مدینہ کو سلام کہنے کی تعلیم دیتے وقت حضورؐ نے چھوٹے بڑے کی تمیز شادی تھی۔ یہ نہیں فرمایا تھا کہ چھوٹے بڑوں کو سلام کہیں اور وہ ان کے سلام کا جواب دیں۔ اس نوع کے جو قواعد وضوابط کو مرتب کئے گئے ہیں وہ شیطانی ذہن کی پیداوار ہیں۔ رحمانی تعلیمات کو ان سے کوئی سروکار نہیں۔ صحابہؓ کبار ایک دوسرے کو سلام کہتے وقت مقام ومنصب کا خیال نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مسلمان بھی سامنے آئے اسے پہلے سلام کہیں۔

انسان جب کبر کا پتلا بن جاتا ہے، عجب اس کے رگ وریشہ میں سما جاتا ہے تو وہ دوسروں کی تعظیم کرنے کی سعادت سے محروم ہو جاتا ہے۔ انسانی عظمت دوسروں سے تعظیم کرانے میں نہیں، تعظیم کرنے میں ہے۔

گمراہی اور ہدایت

نماز میں ہم خدا تعالیٰ سے ان لوگوں کے راستے پر چلنے کی توفیق طلب کرتے ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں جنہیں خدا تعالیٰ نے گمراہیوں سے محفوظ رکھا ہے اور ان لوگوں کی اطاعت سے پناہ مانگتے ہیں جن پر

خدا تعالیٰ کا غضب ہے۔

ربّانی ارشاد کے مطابق سیدھی راہ وہی ہے جس پر نبی، صدیق، شہید اور صالح لوگوں کے قدموں کے نشانات ملتے ہیں جس راہ پر خدا تعالیٰ کے کسی مقبول بندے کے قدموں کا نشان موجود نہ ہو وہ سیدھی راہ نہیں ہو سکتی عقلِ انسانی کوئی ایسا راستہ تلاش کر سکتی ہے جو منزل کی طرف رہنمائی کر سکتا ہو لیکن اس پر کوئی ایسا نقشِ قدم فروزاں نہ ہو جسے ہم خدا تعالیٰ کے کسی نیک بندے کا نقشِ قدم کہہ سکیں تو وہ راہ خدا تعالیٰ کے نزدیک قبول نہیں۔ مقبول وہی راستہ ہے جس پر ان انعام یافتہ لوگوں کا قافلہ گزرا ہے اور اس پر ان کے قدموں کے نشانات ملتے ہیں۔

فکرِ انسانی کے قدم قدم پر بھٹکنے اور گمراہ ہونے کے امکانات موجود ہیں اس لیے حیات کی بھول بھلیوں میں خدا تعالیٰ نے انسان کو رہبری کے بغیر نہیں چھوڑا۔ رات کے مسافر کے لیے ستاروں کی قندیلیں جو کام دیتی ہیں صالحین کے نقوشِ قدم وہی کام دیتے ہیں۔

جو مسافر ستاروں کی قندیلوں کو نظر انداز کر کے سفر کرنا چاہے اور ان کے نور سے استفادے کو توہین خیال کرتا ہے اس کا قدم ٹھوکر سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور جو فکر کو راہنما بناتا ہے صالحین کی راہ

پر نہیں چلتا، وہ خطرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

ظلمتیں ٹھوکر کے سوا کچھ نہیں بخش سکتیں۔ راہنمائی نور کا حصہ ہے سلامتی کے ساتھ منزل رسیدہ ہونے کے لیے نور کی راہنمائی میں آنا پڑتا ہے۔ ہر راہ پر چلنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہوتا ہے کہ یہ شیطان کی راہ تو نہیں! مقبولانِ بارگاہ کی راہ ہے؟

یہ معلوم کر لینے کے بعد انسان مامون و محفوظ ہو جاتا ہے۔ یوں تو زندگی کے ہر موڑ پر انسان کو ہدایت کی ضرورت ہے۔ توفیق ربانی کے بغیر ایک قدم بھی سلامتی کی منزل کی طرف قدم نہیں اٹھ سکتا۔ لیکن انسان جب ہادی اور راہبر کا منصب اختیار کرنے کے بعد ہدایت کی طرف بڑھتا ہے تو اس کے لیے اپنے اعمال کا جائزہ لینا ازبس ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہم ہدایت کی راہ پر ہیں؟ تبلیغ کا پہلا مستحق انسان کا اپنا نفس ہے۔ نفس کا گھوڑا اگر بے لگام ہو اور خواہشات کے دلدل میں پھنس جائے تو ایسا انسان خود ہدایت کا محتاج ہوتا ہے دوسروں کی راہبری کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکتا۔

خداتعالیٰ کے مقبول بندوں نے دوسروں کی ہدایت کی نسبت اپنے نفس کو وعظ کہنے کی زیادہ ضرورت محسوس کی ہے۔ کیونکہ یہ راہ بڑی

کٹھن ہے۔ تزکیہ نفس کے بغیر انسان جب ہادی بن کر نمودار ہوتا تو اس کے نفس کی شرارتیں اقوام وملل کی شیرازہ بندی کا کام نہیں کر سکتیں وہ متحد اور منظم لوگوں میں بھی اضطراب وانتشار پھیلانے کا موجب ثابت ہوتا ہے، ہدایت اس کے نزدیک وہی ہوتی ہے جس سے اس کے نفس کو غذا مل سکتی ہو۔ اور اس کی کبریائی کا لوہا تسلیم کیا جا سکے۔ یہ راہ اپنی برتری تسلیم کرانے کی راہ نہیں عجز وانکسار کی راہ ہے۔ انبیاءؑ کی سیرت ہمارے سامنے ہے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاءؑ نے تشدد کے ذریعے اپنی بات منوانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ تشدد برداشت کیا ہے۔ انتہائی ناساعد حالات میں بھی ان کی زبان آلودگیوں سے پاک رہی ہے۔ لوط علیہ السلام کو قوم نے سفیہ کہا تو وہ برانگیختہ نہیں ہوئے نہایت متانت سے جواب دیا کہ اے قوم! میں سفیہ نہیں، بلکہ تمہارے رب کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

نوح علیہ السلام پر بھی یہی واردات گذری ہے قوم نے انہیں گمراہ کہا اور انہوں نے جذبات کی متانت میں جواب دیا کہ میں گمراہ نہیں۔ بلکہ رب العالمین کا رسول ہوں۔ حضورؐ کا اسوۂ حسنہ بھی ہمارے سامنے ہے جو شخص اپنی بات منوانے کے لیے سب وشتم سے کام لیتا ہے، وہ ہادی نہیں مفسد ہے، ہدایت کے پردے میں اپنی فطری کمینگی کا اظہار کر رہا ہے۔ ہدایت قبول کرنے کے لیے ان ہادیوں کے طریق کار پر عمل پیرا ہونا

ضروری ہے جنہیں خدا ہادی کہتا ہے اور ان کی اطاعت کو لازمی ضروری قرار دیتا ہے۔ ایک سلیم الفطرت انسان کسی شخص کے لب ولہجے سے نہایت آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ اصلاح کا طالب ہے، یا انتظامات کے جوہر دکھا کر فتنہ و فساد کا موجب ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے پیش نظر ہدایت نہیں کچھ اور مقاصد ہیں جو اسے فتنہ انگیزی کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔

شفقت اور رحمت

ہر نعمت تقسیم کرنے سے بڑھتی ہے اور بخل سے زوال پذیر ہوتی ہے۔ رحمت کا بھی شیوہ ہے کہ اسے تقسیم کیا جائے۔ اس میں ان لوگوں کو بھی شریک کیا جائے جو محتاج اور غریب ہوں اور جن کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو۔ ایسے لوگوں کو یہ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ وہ دعا کریں۔ وہ مجسمہ دعا بن جاتے ہیں زبان سے کچھ نہ بھی کہیں لیکن ان کا حال دعا بن جاتا ہے۔ گدا کی صورت سوال بن جاتی ہے تو وہ بھی محرومِ نہیں رہتا۔ اور جب غریب کا حال دعا بن جائے تو رحمتوں کے دروازے کھلنے لگتے ہیں، جو دروازے برسوں کی عبادت سے نہیں کھل سکتے۔ انہیں غریب کی آنکھوں سے گرنے والے شکر کے آنسوؤں کے چند قطرے کھول دیتے ہیں۔ رحمت ابھی دور نہیں،

اس کا ٹھکانا ٹوٹے ہوئے دلوں میں ہے۔ اس روزن سے جھانک کر دیکھا جائے تو شاہد مطلق کے جلوے نظر آنے لگتے ہیں رحمت الٰہی ہم آغوشی کے لیے بے تاب ملے گی۔ قصر و ایوان تو ناز حسن کا مسکن ہوتے ہیں۔ ناز رہنے والی رحمت ان میں کہاں مل سکتی ہے؟ اس کا سراغ تو انہی دلوں سے مل سکتا ہے جو زمانے کے ستائے ہوئے ہوتے ہیں اور ان پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ باحیا اور باعصمت حسن اپنی جلوہ گری کے لیے ہمیشہ انہی خلوتوں کو منتخب کرتا ہے جو ہوس آلود نگاہوں سے مامون ہوں سر بازار جلوہ گری تو حسن کی توہین سمجھی جاتی ہے۔ جو چیز جتنی قیمتی اور لطیف ہوا سے اسی قدر حجاب میں رہنا پڑتا ہے۔ خوشبو لطیف ہے اسی لیے نظر نہیں آتی۔ حسن مطلق نے بھی اپنے لیے بے حجابی کو پسند نہیں کیا۔ دل کی خلوت کو اپنا مسکن بنایا ہے اور دل بھی نظروں سے پوشیدہ ہے اسامنے ہوتا تو شاید یہ بھی تجلی گاہ نہ بن سکتا۔

آوارگیٔ شوق نے بات کہاں سے کہاں پہنچادی۔ ذکر ہو رہا تھا نعمت کی تقسیم کا کہ اہل حاجات پر تقسیم کرنے سے بڑھتی ہے۔ بعض خادمین جو خدا تعالیٰ کی نعمتوں کے خاص وردہ بنے ہیں ان کے تذکروں میں مذکور ہے۔ کہ وہ خدا تعالیٰ کی عاجز اور درماندہ مخلوق پر رحم و کرم کے باعث ہی نوازے گئے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے والد ماجد حضرت شاہ

عبدالرحیم اپنے ایک رسالہ انفاس رحیمیہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت شبلی کو جو مقبولیت اور محبوبیت ملی تھی وہ بلی کے بچے پر رحم و کرم کا نتیجہ تھا عبادت گذاری میں شبلی کی عمر گزر گئی لیکن انہیں وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو انہیں شبلی بنا سکتا۔ ایک رات تہجد کے لیے اٹھے تو انہیں اپنی قمیص کی آستین میں کسی چیز کا احساس ہوا۔ ٹٹول کر دیکھا تو بلی کا بچہ تھا جو سردی سے پناہ حاصل کرنے کے لیے ان کی آستین میں آ دبکا تھا۔ آستین میں گرم ہونے کے باعث اسے نیند آ گئی۔ شبلی تہجد کے لیے اٹھنے لگے تو انہیں خیال گزرا کہ میرے حرکت کرنے سے اسے تکلیف ہو گی اس کی نیند خراب ہو جائے گی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ رک گئے۔ دل میں کہنے لگے کہ آج کی عبادت خدا تعالیٰ کی اس ضعیف مخلوق کے آرام پر قربان کرتا ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی انہیں مقبول بنا لیا گیا۔ جو کام برسوں کی سجدہ ریزیوں سے نہ ہوا تھا ایک ضعیف مخلوق پر رحم کرنے سے ہو گیا۔ قرب و بعد کے مراحل کے متعلق نہ جانے دنیا نے کیا کیا افسانے تراش رکھے ہیں حالانکہ بات اتنی سی ہے کہ جس کا قرب مطلوب ہو اس کی صفات اختیار کرنی چاہئیں۔ شرابی کبھی متقی کو دوست نہیں بن سکتا۔ دونوں میں سے ایک کو اپنی صفات ترک کرنی پڑیں گی۔ اسی صورت میں دوستی قائم ہو سکتی ہے۔ بندہ بھی جب خدا تعالیٰ کی صفات اختیار کر لیتا ہے تو اسے ادھر سے خدا اپنی

آنے لگتی ہیں۔ مخلوق پر رحم و کرم خدا تعالیٰ کی عادت ہے۔ بندہ بھی اپنے اندر یہ خوبی پیدا کر لیتا ہے تو مستحق کرم قرار پاتا ہے۔ ظالم اور بے درد انسان کو کسی حال میں بھی یہ توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ اس کے ہاتھ اور زبان سے ہمیشہ خدا کی مخلوق کو نقصان پہنچتا ہے۔

ابدی زندگی

بعض عارفین کا قول ہے کہ انسان کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ خلوت میں یا رحمٰن اس کے ساتھ ہوتا ہے، یا شیطان۔ جو واردات اسے پیش آئیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا رفیق تنہائی کون ہے۔؟ رحمٰن کی معیت نصیب ہو گی تو رحمانی کیفیات وارد ہوں گی۔ شیطان ہم نشین ہے تو دل و دماغ میں شیطانی خیالات پیدا ہوں گے۔ صحبت کسی کی بھی اپنا رنگ دکھائے بغیر نہ رہے گی۔ وجدان بھی متاثر ہو گا اور شعور بھی۔ احساسات تک اثر قبول کیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

عبداللہ بن مبارک سے ایک دفعہ کسی نے سوال کیا کہ تنہائی میں آپ کا دل نہیں گھبراتا؟ آپ زیادہ وقت تنہائی میں گزارتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ تنہائی میں، یعنی قرآن و حدیث کا مطالعہ کرنا ہوں۔ مجھے تنہائی

اور اس کے حبیب پاک علیہ السلام کی صحبت نصیب ہوتی ہے۔ مجھے تنہا کیسے کہا جا سکتا ہے؟

زبان پر کسی کا ذکر بھی ہو اور دل میں اس کی یاد بھی موجود نہ ہو تو وہ قریب ہوتا ہے اسے دور نہیں کہا جا سکتا۔ دور تو وہ ہوتے ہیں جن کا نہ ہی کبھی زبان پر ذکر آئے اور نہ ہی ان کی یاد دل کو کیف و سرور بخشے۔ دل میں بسنے والا، ذکر بن کر زبان پر آنے والا، احساسات کی دنیا میں تلاطم پیدا کر دینے والا کبھی دور نہیں ہوتا خواہ وہ کہیں بھی ہو۔ سات سمندروں میں چھپ کر بھی وہ بے حجاب ہوتا ہے۔ اسے دل کی آنکھیں دیکھتی ہیں، دل کے کان اس کی باتیں سنتے ہیں اور دل اس کے جمال سے لذت یاب ہوتا ہے۔

روح کی لذتیں جسمانی لذات پر موقوف نہیں یہ احساسات کا کھیل ہے۔ احساس زندہ ہو تو وہ محسوسات کی دنیا کی خبر رکھتا ہے لیکن حقیقتوں کو خبر ہی نہیں جو اس حد پہ پہنچے وہ روح کے احساسات و مدرکات کی وسعتوں سے باہر نہیں ہوتی۔ جسم کو مادی غذا سے تقویت ملتی ہے اور ظاہری حواس کی صحت بھی جسمانی توانائی کا نتیجہ کہلاتی ہے۔ قوتیں جب مضمحل ہو جائیں تو حواس بھی متاثر ہوتے ہیں۔ روحانی احساسات کی صحت روح کی صحت پر موقوف ہے۔ روح

توانا اور صحت مند ہو تو روحانی احساسات میں بھی بلا کی قوت ہوتی ہے۔ وہ متاثر ہوتے بھی ہیں اور متاثر کرتے بھی ہیں۔

بیمار جسم نہ غذا سے متاثر ہو سکتا ہے اور نہ دوسروں ہی پر کوئی خوشگوار اثر ڈال سکتا ہے۔ روح کی غذا جسم کی غذا سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ روح کو اپنی صحت برقرار رکھنے کے لیے یادِ الٰہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یادِ الٰہی جب اس کا وظیفۂ حیات بن جاتی ہے۔ تو اسے مفلوج کر دینے والی بیماریوں کے حملے کا اندیشہ نہیں رہتا۔ صالح خون جسم کی توانائی کا ضامن ہوتا ہے اور روح کو زندگی عطا کرنے والی یادِ دوست اسے مرنے نہیں دیتی۔ ذاکر روح یہاں بھی زندہ رہتی ہے اور وہاں بھی یہاں بھی یادِ دوست اس کی غذا ہوتی ہے اور وہاں بھی اسے یہ غذا ملے گی۔ یاد زندگی ہے اور غفلت موت، غافل انسان زندہ رہ کر بھی مردہ ہوتا ہے اور ذاکر مر کر بھی حیاتِ جاوید کا مالک بن جاتا ہے ایک حیّ و قیوم ذات سے تعلقات کی استواری اسے مرنے نہیں دیتی۔ اللہ کی راہ میں جان نثار کرنے والوں کو زندہ کہا گیا ہے۔ کیونکہ یاد ہی ان کا سرمایہ حیات تھی۔ اور یاد ہی سے وہ زندگی پاتے رہتے ہیں۔

اخلاقی اقدار

سعد ابن ابی وقاصؓ کی زیر قیادت غازیانِ اسلام جب ایران میں فتح و نصرت کے پرچم لہرا رہے تھے تو ایک محاذ پر انہیں عجیب و غریب صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ جندی سابور کا محاذ تھا جہاں کے لوگ قلعہ بند ہو کر صحابہؓ کی کوششوں کو ناکام بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اندھیرے میں وہ اچانک نکل کر اسلامی لشکر پر حملہ آور ہوتے اور جان بچا کر قلعہ میں داخل ہو جاتے۔

ایک دن اچانک قلعہ کا دروازہ کھلا اور ایرانی بے تکلفی سے ادھر ادھر گھومنے لگے۔ بعض قابلِ فروخت چیزیں لے کر مسلمانوں کے پاس آ گئے۔ صحابہؓ کے لیے یہ صورتِ حال انتہائی حیران کن تھی۔ ان کے استفسار پر ایرانیوں نے بتایا کہ اس امر کے علم بردار دل سے ہماری صلح ہو گئی جب وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ایک ایسا خط پیش کیا جو کسی نے مسلمانوں کی طرف سے لکھ کر قلعہ کی دیوار سے اندر

پھینک دیا تھا۔

مسلمانوں نے کہا کہ ہم نے ہرگز ایسا کوئی خط نہیں لکھا اور نہ ہی تمہیں ایسی کوئی پیش کش کی ہے جس کا مقصد امن ہو ہم تو محاذ پر جنگ کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ لیکن ایرانیوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس تحریر موجود ہے۔

سالار لشکر کے مشورے سے جب خط لکھنے والے کے متعلق چھان بین شروع کی گئی تو معلوم ہوا یہ ایک ایرانی ہی کا کارنامہ ہے جو اسلامی کیمپ میں غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ مسلمانوں نے ایرانیوں سے کہا کہ یہ ہمارے ہی آدمی کا لکھا ہوا خط ہے جس کے ہم ذمہ دار نہیں لیکن ایرانیوں نے یہ عذر تسلیم نہ کیا۔ ان کا اصرار تھا کہ خط خواہ غلام نے لکھا ہو یا آزاد نے بہرحال یہ تمہاری طرف سے موصول ہوا ہے جس کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔

اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے بہت غور و خوض کیا گیا لیکن کوئی واضح صورت سامنے نہ آئی۔ یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی جس کی عہد نبوی میں کوئی مثال موجود نہ تھی۔ آخر حضرت عمرؓ کو خط لکھا گیا اور جو صورت پیش آئی تھی وہ ان کے سامنے بیان کی گئی۔

حضرت عمرؓ نے سالار لشکر حضرت ابن ابی وقاص کو جو خط لکھا اس کا متن

ہے کہ جب تک یہ مسلمانوں میں داخل نہ تھے جب کہ میدانِ جنگ میں [illegible]
دشمن کو شکست دے دو [illegible] کے پاؤں اکھڑ جائیں [illegible]
[illegible] کسی [illegible] سے [illegible] تم [illegible]
[illegible] کے ذریعہ تم کسی کے سینے میں [illegible]
باعث بن سکتی تھی۔ یہ حرکت جو دوسروں کی دل آزاری اور
پریشانی کا باعث ثابت ہو، متقیوں کے لئے ایفائے عہد کی پابندی
ضروری ہے اور تم اس وقت تک متقیوں میں داخل نہیں ہو سکتے
جب تک اس عہد کو پورا نہ کرو جس کے بارے میں تمہیں شبہ ہو کہ آیا
اس عہد کو پورا کرنا تم پر فرض ہے یا نہیں۔

جب خدا نے تم کو اندر رہنے کا پیغام لکھ کر دیا تھا اگر ان کو یقین
نہ ہوتا کہ مسلمان اس کی پابندی کریں گے تو وہ کبھی اپنی قوم کو ہلاکت میں
ڈالنے کی غلطی نہ کرتے۔ مسلمانوں کے قرب کے باعث وہ ان کے اخلاق
و اعمال سے پوری طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ اور یہی یقین و اعتماد اس کے
خط لکھنے کا باعث بنا۔

ایرانیوں کو بھی [illegible] مسلمانوں کی اخلاقی بلندی پر کامل اعتماد
نہ ہوتا تو وہ قابلِ فروخت چیزیں لے کر اسلامی کیمپ میں
نہ پہنچ جاتے۔ اسلام کے علمبرداروں نے اخلاقی بلندی

کی جو مثالیں پیش کی گئیں ان کا دوست دشمن سب کو اعتراف تھا۔ سب ان کے گرویدہ تھے اور یہی اخلاقی قوت ان کی کامیابیوں کی ضامن تھی۔

حضرت عمرؓ کے جواب سے اخلاقی اقدار کے جو مظاہر سامنے آتے ہیں کیا ان کی کسی اور جگہ مثال مل سکتی ہے۔ ایسی اخلاقی اقدار کی حامل قوم اگر اخلاق کے ابتدائی مقتضیات سے بھی عاری ہو جائے تو اسے عبرت کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے؟

قلب و نظر

موقع پرست انسان ہر وقت ان مواقع کی تلاش میں رہتا ہے جن کے ذریعے وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکے۔ رسولِ خدا علیہ السلام کی قیادت میں غزوۂ تبوک میں شریک ہو کر بڑی سعادتیں سمیٹنے کا وقت آتا ہے تو اس کی نظر ان سعادتوں پر نہیں ہوتی بلکہ وہ مدینے کی چھاؤں اور ٹھنڈک کو یاد کرنے لگتا ہے۔ حق پرست انسان کو تحقیق عزیز نہیں ہوتی۔ اس کی توجہ کا مرکز وہ مقاصد ہوتے ہیں جو اسے جان سے عزیز تر ہوتے ہیں۔ جان و مال کے زیاں کے بعد بھی اگر وہ ان مقاصد کے غیر متزلزل

کا موجب ثابت ہو سکے تو اس قربانی کو طمانیت کا موجب جانتا ہے۔ مفاد پرست انسان کو مفاد حاصل کر کے خوشی ہوتی ہے خواہ یہ خوشی اسے کتنے بھی اصول و نظریات قربان کر دینے کے بعد حاصل ہو۔ وہ مطمئن ہوتا ہے اور اصول و نظریات کی تائید و حمایت کو منتہائے مقصود جاننے والا کسی ایسے مفاد کو قبول کرنا پسند نہیں کرتا جس کے ذریعے اس کے اصول و نظریات کو ہلکا سا نقصان پہنچنے کا احتمال بھی پیدا ہو سکے ایک کی تگ و دو اپنے لیے ہوتی ہے اور ایک دوسروں کے لیے زندگی گذار دیتا ہے۔ ایک کو راحتیں عزیز ہوتی ہیں اور ایک ان مشکلات کو عزیز جانتا ہے جو اسے راہ حق میں پیش آتی ہیں۔ دونوں کے نظریات الگ ہوتے ہیں۔ دونوں کے زاویۂ نگاہ میں کوئی تطابق نہیں ہوتا۔ دونوں کو اپنی اپنی منزل عزیز ہوتی ہے اور وہ اسی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ مفاد پرست انسان کو دلائل کے ذریعے کسی نظریہ حیات کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ دل پابندی قبول کر لیتا ہے تو دلائل کی حاجت نہیں رہتی۔ دلائل تو اس وقت کام دیتے ہیں جب ذہن میں کوئی الجھن ہو۔ دل مطمئن نہ ہو سکے۔ دل کے اطمینان کا تعلق حجت و برہان سے ہوتا تو وہ تمام کفار و مشرکین ایمان لے آتے جن کے سامنے انبیاء و مرسلین روشن دلیلیں لے کر آئے تھے۔

مومن انسان کو اندھا بنا دیتی ہے تو کوئی بڑی سے بڑی
دلیل بھی مفید نہیں رہتی۔ دل میں حق قبول کرنے کی صلاحیت
موجود ہو تو دلیلوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ سیدھی بات بھی
دل میں اتر جاتی ہے۔ اور انسان اس کی تائید کرنا بہت
دنیا کی بڑی قیمتی متاع سمجھتا ہے۔ انبیاء پر جو لوگ بھی ایمان
لائے ہیں انہوں نے محض دلائل کے ذریعے ایمان حاصل
نہیں کیا بلکہ پیغمبر کی سچی ہوئی دعوت ان کے روح و قلب
پر اثر انداز ہوگئی اور انہوں نے اپنے تمام مفادات کو
پس پشت ڈال کر ایمان قبول کرلیا۔ جو لوگ قیل و قال
میں الجھے رہے اور ان کی نظر مفادات پر رہی انہیں ہدایت
نصیب نہ ہوسکی۔ ان کا ذہن نئے نئے شاخسانے تیار کرتا رہا
اور منطقی موشگافیوں کا تسلط انہیں انبیاء کی لائی ہوئی
تعلیمات کی نصرت وحمایت پر آمادہ نہ کرسکا۔

آمادگی دل کا فعل ہے یہ محبت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ عقل اگر رہنمائی
کرتی ہے تو اپنے مفادات کو نہیں بھولنے دیتی۔ محض عقل پسندی
اختیار کرلیتی ہے۔ محبت نے پسپا ہونا نہیں سیکھا۔ پسپا ہونا اس کے
نزدیک بدترین جرم ہے۔ اس نے اپنی تاریخ حیات میں کبھی اس جرم
کا ارتکاب نہیں کیا اور نہ ہی اسے طاقت پر کبھی

افسوس ہوتا ہے۔ ہوس لوٹ کر بھی کف افسوس ملتی ہے کہ زیادہ غارت نہ کر سکی اور محبت لٹ کر بھی شاد رہتی ہے کہ سرمایۂ زیست کام آیا جو پہلے محبوب کی شان کے لائق نہ تھی اسے قبول کر لیا گیا۔ ہوس اپنے قلیل نقصان کو بھی کثیر جانتی ہے اور محبت کثیر کو بھی قلیل سمجھتی ہے۔ یہ دونوں سے اختلاف ظرف کا نتیجہ ہے۔ ایک کو قدرت نے کشادہ ظرفی و کشادہ نظری عطا کی ہے اور ایک دل سے کم ظرف ہے۔ جس کے قلب و نظر کو نہ کبھی وسعتیں نصیب ہوئی ہیں اور نہ ہوں گی۔

اعمال اور نیات

اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔ نیت اگر بخیر ہو تو اس کا حسن اعمال کی صورت میں ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ بری نیت اچھے اعمال کو بھی غارت کر کے رکھ دیتی ہے۔ ابن سیرینؒ جو ایک مشہور عارف گذرے ہیں اور جنہیں خواب کی تعبیر کا خاص ملکہ عطا ہوا تھا۔ ایک دفعہ ان سے کسی نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ اذان دے رہا ہوں۔ ابن سیرینؒ نے فرمایا کہ تم تختہ دار پر لٹکائے جاؤ گے۔ ایک اور شخص سے یہی خواب سن کر آپ نے اسے مرجع خلائق

بننے کی بشارت دی۔ بعض لوگوں نے سوال کیا کہ ایک ہی خواب کی اس قدر مختلف اور متضاد تعبیر کیوں بیان کی گئی ہے؟ ابن سیرینؒ نے فرمایا کہ خواب اگرچہ ایک ہی تھا۔ لیکن دونوں کی نیتوں میں فرق تھا، ایک بدنیت تھا۔ اور ایک نیک نیت۔ اذان باطنی کیفیت کو ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے جس کی نیت نیک تھی اس کی باطنی کیفیت ظاہر ہونے کے بعد لوگ اس سے عقیدت کا اظہار کرنے لگیں گے اور وہ عوام میں محبوب بن جائے گا۔ جس کی نیت فاسد تھی وہ ظاہر ہوگئی تو ننگا ہو جائے گا۔ باطن کا حال ظاہر ہونے کے بعد اس کا مقام تختۂ دار ہوگا۔

نیت کا حسن و قبح افراد کے ذاتی اعمال ہی کو متاثر نہیں کرتا بلکہ اس کا اثر دوسروں تک بھی پہنچتا ہے۔ کسی قوم کے رہنما نیک دل، خدا ترس اور خدمتِ ملک و ملت کے جذبات سے معمور ہوں تو پوری قوم متاثر ہوگی۔ ایثار اس کا شعار بن جائے گا۔ خودغرض اور نفس پرست رہنماؤں کی نیت کا فساد مختلف رنگوں میں ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ رزق سے خیر و برکت اٹھ جاتی ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی روح سکون سے محروم رہتی ہے۔ جائز و ناجائز ذرائع سے دولت سمیٹنے کے منصوبے تیار ہونے لگتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ چاروں طرف اضطراب و انتشار پھیل جاتا ہے۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنا دامن بھرلے در

دوسروں کو محروم کر دے۔ انسانی ہمدردی اور اخوت کے جذبات سے دل قطعی طور پر خالی ہو جاتے ہیں۔ سامنے ایک انسان مر رہا ہو تو کوئی اس کے منہ میں پانی ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ حکام کو عیش و عشرت میں مست دیکھ کر چھوٹے ملازم بھی اس ڈگر پر چل نکلتے ہیں۔ اور ان کی کوشش یہ نہیں ہوتی کہ مظلوم کی داد رسی کریں وہ ہر مظلوم اور فریادی کے لیے اللہ کریم کا عذاب ثابت ہوتے ہیں۔ مظلوموں کے لیے نئی نئی مشکلات پیدا کر کے ان کے لیے جینا حرام کر دیتے ہیں۔ یہ سب امیروں کی نیت کا فتور ہے جو پورے قافلے کو ہلاکتوں، تباہیوں اور بربادیوں سے دوچار کر دیتا ہے۔ ایک نیک دل قائد کی نیک دلی اور روشن ضمیری پوری قوم کی تقدیر بدل کر رکھ دیتی ہے۔

گلستان میں شیخ سعدیؒ نے ہارون رشید کا جو واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ اپنے اندر بصیرتوں کے کس قدر سامان رکھتا ہے۔ سعدی کے بقول "شاہ ایک زمیندار کے باغ میں گیا۔ شاہ کو تھکا ماندہ دیکھ کر باغ کے مالک نے انار کا رس پینے کے لیے دیا۔ انار کا افشردہ پی کر شاہ کی نیت خراب ہو گئی۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ جس باغ کے انار کا رس اس قدر شیریں اور خوش ذائقہ ہے کیوں نہ اسے ہتھیا لیا جائے؟

نیت کے بدلنے کے بعد جب شاہ نے دوبارہ انار کا رس طلب

کیا تو اس کا نہ پہلا سا ذائقہ تھا نہ ہی انار سے پہلے کی طرح رس نکلا۔ شاہ نے باغ کے مالک سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے پہلے انار سے جو رس نکلا تھا اس سے پیالہ بھی بھر گیا تھا اور اس کا ذائقہ بھی لذیذ تھا۔ یہ رس کم بھی ہے اور ترش بھی؟

باغبان نے جواب دیا معلوم یہ ہوتا ہے کہ شاہ کی نیت بدل گئی ہے نیت ہی کی بدولت انار کی کیفیت میں فرق آگیا ہے۔

حضور صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے اعمال سے پہلے نیت کی درستگی کی جو تعلیم دی ہے اسے بعض لوگوں نے عبادات تک محدود کر دیا ہے۔ حالانکہ نیت مادے پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جسے نیت کے اچھے برے اثرات سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکے۔

انسانی تخلیق

گناہ میں بھی ایک لذت ہے۔ اور ثواب میں بھی لیکن دونوں کی فطرت چونکہ جداگانہ ہے اس لیے دونوں کی لذت بھی جدا جدا ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک سے روح کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے دل زندگی پاتا ہے اور ایک دل کی موت کا سامان ثابت ہوتا ہے۔ گناہ کی عادت

لذت انسان کو باطنی طور پر کھوکھلا کر کے رکھ دیتی ہے اور اس کے وجود میں وہ جاذبیت و کشش نہیں رہتی جو جوہر انسانیت کہلاتی ہے۔ اور مردہ دل کو زندگی عطا کر سکتی ہے۔ برگزیدہ انسان کا دل خود بھی روشن ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی روشنی عطا کر سکتا ہے جس دل میں خدا تعالیٰ کی توحید کا نور موجود ہو اس کے پاس بیٹھنے سے بھی تسکین حاصل ہوتی ہے اور ربانی انوار روحوں پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سیاہ باطن انسان کا قرب بھی عذاب الیم سے کم نہیں ہوتا۔ وہ روح کو پریشان کر کے چھوڑتا ہے۔ اس کی صحبت خیر کے سرچشموں کی طرف رہنمائی کی بجائے باطل کی تدبیروں کی طرف کھینچ کر لے جاتی۔ سیہ جہاں ظلمتوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

حضور علیہ السلام سے ایک دفعہ صحابہؓ نے خدا کے دوست کی علامت دریافت کی تو حضورؐ نے فرمایا کہ خدا کا مقرب وہ ہے جسے دیکھ کر خدا یاد آ جائے۔

پھولوں کا حسن باغ کی نکہتوں کا غماز ہوتا ہے جسے دیکھ کر باغ کی لطافتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ بندۂ حق بھی وہی کہلا سکتا ہے جس سے بندگی کی شان آشکارا ہو اور جسے دیکھ کر بندگی کا مفہوم سمجھ میں آنے لگے۔ آئینے کا جمال ذاتی نہیں ہوتا بلکہ کسی حسین کے حسن و جمال کا پرتو ہوتا

ہے۔ دل بھی جب رحمٰن کی منزل بن جاتا ہے تو حسن کے جلوے پھوٹ پھوٹ کر نکلنے لگتے ہیں۔ ذات میں بھی، صفات میں بھی حسین نظر آنے لگتی ہیں اور ذات کے حسن کے فروغ کو بھی نگاہیں محسوس کرتی ہیں۔ بجھے ہوئے چراغ سے روشنی کی توقع نہیں کی جا سکتی اور بجھے ہوئے دل سے ایمان کی حرارت کا حاصل ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ آگ کی خصیت ہی جلانا ہے۔ جو چیز بھی اس میں داخل ہو گی وہ اسے جلا دے گی۔ اسے اپنا مزاج عطا کر دے گی۔

بندہ بھی جب صفات ربانی میں ڈھل جاتا ہے تو مظہر ذات و صفات بن جاتا ہے تو جو بندگی صفات میں کوئی انقلاب پیدا نہ کر سکے، بندے کی ذات میں اس کا کوئی اثر ظاہر نہ ہو وہ بندگی نہیں، بندگی کی ایک صورت ہوتی ہے جو حقیقت سے آشنا نہیں ہوتی۔

آشنائی رسمی تعلقات کا نام نہیں، یہ دل دینے اور دل لینے سے حاصل ہوتی ہے۔ جو دل دے دیتے ہیں وہ بھی آشنا ہوتے ہیں اور جو دل لے لیتے ہیں انہیں بھی بیگانہ نہیں کہا جا سکتا۔ آشنائی کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے، دونوں صاحب منزل ہوتے ہیں، دونوں صاحب حضور کہلاتے ہیں اور دونوں کو حضوری کی لذتیں حاصل ہوتی ہیں۔

نہ دل دیا جائے نہ لیا جائے نہ کسی کی رضا میں فنا ہونے کی
توفیق نصیب ہو اور نہ ہی کسی کو اپنے من میں بسایا جائے تو
یہ آشنائی کی کون سی قسم ہوگی اور اس قسم کے تعلقات سے
کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

قواعد و ضوابط

جن امور میں انسان کا انہماک بڑھ جاتا ہے قدرت کی طرف سے
انہیں سمجھنے کی اسے ایک خاص صلاحیت عطا ہوتی ہے۔ کاشت کار
کاشتکاری کے جن اسرار و غوامض سے واقف ہوتا ہے۔ وہ ایک شاعر
کی فکر رسا میں نہیں آ سکتے۔ لطیف جذبات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے
والا شاعر لطیف جذبات و کیفیات کی ترجمانی تو کر سکتا ہے۔ لیکن زمین
کا سینہ چیر کر کھیت کو گل و گلزار نہیں بنا سکتا اور نہ ہی اس کی نظر ان
احوال و کیفیات کا جائزہ لے سکتی ہے۔ جن سے گذر کر ایک دانے کو پودا
بننے کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ شاعر کے وجدان کی سطح پہ الہامات
کے جو بادل برستے ہیں۔ وہ ان سے واقف ہوتا ہے اور کھیتوں پہ
کڑکنے والی بجلیوں اور برسنے والے بادلوں کی مزاج دانی کا ملکہ

صرف کاشتکار کو عطا ہوتا ہے۔ ایک کو دوسرے کی دنیا کی خبر نہیں ہوتی اور ایک دوسرے کے احوال و کیفیات کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے تاجر جو ایک پیسے سے دو پیسے بنا لیتے اور ایک لاکھ کو دو لاکھ کے سرمایہ میں ڈھال لینے کی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے وہ یک فلسفی اور ادیب کو نصیب نہیں ہوتیں۔ امور خواہ دنیوی ہوں یا دینی جن میں انہماک زیادہ ہوگا جن کے سمجھنے در فروغ دیتے ہیں زیادہ عمر صرف ہوگی۔ انہیں کی معرفت حاصل ہوگی۔ ایک کافر بھی انشراحِ صدر ہوتا ہے۔ اور ایک مومن کا سینہ بھی معارف ربانیہ کے لیے کشادہ کیا جاتا ہے سینے کی وسعت دونوں کو نصیب ہوتی ہے لیکن دونوں کی سمجھ بوجھ اور سینے کی وسعت میں یہ بنیادی فرق ہوتا ہے کہ ایک کفر کے لیے وسعت اور ایک کو ایمان کی تجلیاں سمیٹنے کے لیے عالی ظرف بخشا جاتا ہے۔

جو ذہانت طغیان و سرکشی کے لیے نئی نئی راہیں کھول دے وہ خدا کی رحمت نہیں بلکہ عذاب الیم ہوتی ہے۔ باطل کے پیٹ سے کبھی نور پیدا نہیں ہو سکتا چراغ ہی کے ذریعے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔ زن بازاری جس بھی بچے کو جنم دے گی وہ حرامی کہلائے گا۔ صاحبِ نسبت وہی ہو سکتا ہے جس کی پیدائش دین حنیف کے مروجہ اصول و آئین کے تحت ہوگی، دنیا کے نزدیک حرامی اور

کہ یہاں معاشرت کے بنے بندھے آئین و ضوابط کے تحت ہوتی ہے
زن و زن میں سے ہر ایک مادر پدر آزاد سمجھا جاتا ہے جس کے ذہن و ضمیر کو مسلّمہ
کی پابندی گوارا۔ نہ ضمیر انہیں رکھتا ہی ہے تو اسلام کے قواعد و ضوابط سے
آزاد ہو کر اور ضمیر کی شکست کرنے لگتا ہے تو وہ بھی کسی اسلامی ضابطے
کا پابند نہیں ہوتا۔

زن و شوہر کے ایجاب و قبول سے دونوں میں اشتراک پیدا
ہو جاتا ہے اور بندے اور مولا کے عہد محبت سے دونوں میں ایک
رابطہ و تعلق قائم ہو جاتا ہے جو کسی طرح ٹوٹنے نہیں پاتا۔ بندے پر
عہد کی پاسداری لازم ہوتی ہے اور مولا بھی اسے لاوارث نہیں چھوڑتا
ہے اس کی دعائیں سنتا ہے۔ اس کی ضرورتیں پوری کرتا ہے اور اس
کی عزت و آبرو کا نگہبان بن جاتا ہے۔ لیکن یہ صورت اسی وقت پیدا
ہوتی ہے جب بندے کو بھی اپنے عہد کا پاس اور لحاظ ہو۔ اور وہ
عورت خاوند کی ہمدردیوں کی مستحق نہیں ہوتی۔ آوارہ مزاج عمل تا
کی شفقت و راحت کا مستحق قرار نہیں پاتا اور وہ بندہ اپنے مولا
کی نظروں سے گر جاتا ہے۔

بدی کی تخلیق

خدا تعالیٰ کی مصلحتوں اور حکمتوں کو سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں معرفت کے دروازے انہی لوگوں پر کھلتے ہیں جنہیں قرب حاصل ہوتا ہے قرب حاصل کیے بغیر کسی دنیوی شاہ کی مملکت کے بھید بھی معلوم نہیں کیے جا سکتے چہ جائیکہ اس ذات کے بھید معلوم کیے جا سکیں جس کی مملکت غیر فانی ہے۔ کسی کے گھر جا کر کوئی وہاں کے نظم و نسق، وہاں کی طرز بود و باش اور مکینوں کے انداز و اطوار پر اعتراض کرنے لگے تو صاحبِ خانہ اسے اپنی خصوصی توجہ سے نہیں نوازے گا۔ بلکہ یہ کہہ کر گھر سے نکال دے گا کہ جو خانہ تجھے بھلا معلوم ہوتا ہے وہاں چلا جا! میرے گھر ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ صاحب خانہ سے اگر نسبت خصوصی حاصل ہو تو وہ مہمان کے کہنے پر اپنے کمرے کی ترتیب میں ترمیم کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے لیکن ایک فقیر اور ایک گدا کے کہنے پر کوئی اپنے مکان کی ترتیب بدلنے پر تیار نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اسے یہ بتانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ میز جس جگہ رکھی ہے۔ اس کے رکھنے میں کیا مصلحت ہے۔ بعینہٖ

تو اپنی ذات سے کامل تعلق رکھنے والوں پر واضح کی جاتی ہیں۔ ہر کہ و مہ کی بات کون سنتا ہے اور اسے کون شایانِ توجہ سمجھتا ہے؟

اللہ تعالیٰ بھی اپنی مصلحتوں کو انہی لوگوں پر واضح کرتا ہے جو اس کے مقبول بندے ہوتے ہیں کوئی مصلحت کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس کی اسے پروا نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی ہر کس و ناکس کو شریکِ راز کرنا اس کی عادت ہے۔ جو لوگ اس چکر میں پڑے رہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ایسا کیوں کیا، ایسا کیوں نہیں کیا، وہ بندگی ہی کے مفہوم سے بے خبر رہتے ہیں، معقولیت کی راہ سے بھی ہٹے ہوتے ہیں۔ آخر دنیا میں ایسا کون سا حکمران ہے جس نے اپنی ساری مصلحتیں ہر آدمی پر واضح کر دی ہوں؟ مصلحتوں کا علم تو خاصانِ بارگاہ کا حصہ ہوتا ہے۔

بہت سی چیزیں جنہیں ہم ناپسند کرتے ہیں ہمارے لیے مفید ثابت ہوتی ہیں اور بہت سی محبوب چیزیں ہمارے خسارے کا موجب ثابت ہوتی ہیں۔ یہ ہمارا روز مرہ کا مشاہدہ ہے۔ چند دن ہوئے بعض احباب میں یہ بحث ہو رہی تھی کہ خدا تعالیٰ نے شیطان کو کیوں پیدا کیا؟ معترض صاحب یہ اعتراض کرتے وقت، اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ ان کا اپنا وجود بھی غیر اہم اور غیر ضروری نہیں۔ رب تعالیٰ نے کوئی چیز بے فائدہ پیدا نہیں

کی بعض ایسی چیزیں ہیں جن کی اہمیت صدیاں گزرنے کے بعد جا کر واضح ہوئی ہے۔ ریل گاڑی کی ایجاد سے پہلے کسے معلوم تھا کہ بھاپ میں اتنی قوت ہے۔ بجلی کا علم کسے تھا۔ ایٹم کی قوت سے کون واقف تھا؟ معلوم نہیں سینۂ کائنات میں ابھی کتنے راز پوشیدہ ہیں جو اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہو کر انسان کو حیرت زدہ کر دیں گے۔ شیطان کے وجود کا اگر کوئی اور مصرف نہ بھی ہوتا تو کیا کم ہے کہ وہ شیطان اور رحمٰن کے بندوں میں فرق و امتیاز کا موجب ثابت ہو رہا ہے۔ شیطانی قوتوں کے بغیر خدا تعالیٰ کے نیک اور مخلص بندوں کی پہچان کیسے ہو سکتی تھی؟ شاہراہوں پر ممنوعہ علاقہ لکھا ہوتا ہے۔ ان پر چلنے والا مجرم قرار پاتا ہے۔ اب اگر کوئی یہ اعتراض کرنے لگے کہ ان شاہراہوں پر چلنا اگر جرم ہے تو انہیں تعمیر ہی کیوں کیا گیا ہے تو اس کے فاترالعقل ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ بدی کی تخلیق بھی بے معنی نہیں۔ بدی ایک ایسی شاہراہ ہے جسے ممنوعہ علاقہ کہا جا سکتا ہے۔ جس طرح ممنوعہ علاقہ میں داخل ہونے والا حکومت کا مطیع و فرماں بردار نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی بدی قبول کرنے والے بھی مطیع نہیں ہو سکتے۔

مشعلِ ہدایت

آفتاب کی روشنی میں رہنما اور چراغ دونوں ضرورت ہیں۔ لیکن ایک کا دل خطرے سے خالی ہو تو طلب اور رہنمائی اس کی نگاہ میں بڑی ہے ایک کو قدم قدم پر خطروں کی رہنمائی کے قدم نہیں تبھی وہ اعتماد نہیں ہوتا جو سفر طے کرنے کے لیے ضروری ہے۔ رہنما کا اعتماد مسافر کی بڑی قیمتی پونجی ہوتی ہے جو سفر میں ڈھال کا کام دیتا ہے۔ یاس سے محفوظ رکھتا ہے اور نئی تاب و تواں بخشتا ہے جو سفر کی کلفتوں سے پیدا ہونے والی بددلی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

آفتاب کی روشنی سے محروم، لاٹھی کے سہارے چلنے والا انسان ان سعادتوں سے محروم ہوتا ہے۔ جو لوگ نبوت کی روشنی کو چھوڑ کر عقل کی لاٹھی کو رہنما بنا لیتے ہیں ان کی مثال ان اندھے سے مختلف نہیں ہوتی جو رستے میں رہنما کے سہارے کے بغیر ہی منزل کی طرف بڑھتے ہیں اور ہر حرکت تجربہ معلوم کریں ان کا مقصد بن جاتی ہیں۔ اندھا اندھے کا رہنما نہیں بن سکتا نادیدہ راہوں پر چلنے کے لیے ایسے رہنما کی ضرورت ہوتی ہے جو دیکھتا

کے نشیب و فراز سے بھی واقف ہو، منزل کا سراغ بھی دے اور سفر کی تھکن دور کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو، جہاں یاس کے اندھیرے چھائے ہوں وہ افکار کی تجلی بکھیر کر راہوں کو منور کر دے۔ دن کا سفر طے کرنے کے لیے قدرت نے آفتاب تخلیق کیا ہے۔ رات کے راہنما ستارے ہیں اور آخرت کی منزل تک پہنچنے کے لیے نبوت کا نورِ مشعلِ ہدایت کا کام دیتا ہے۔ ہر منزل کے لیے الگ رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح ہاتھ کا کام پاؤں، اور آنکھ کا کان نہیں دے سکتے، ایسے ہی ابدی منزل تک پہنچنے کے لیے عقل کی راہنمائی سودمند نہیں ہو سکتی۔ یہاں نبوت کا نور ہی رہنما بن سکتا ہے۔

دانا مسافر راستے میں رہنما سے الجھتا نہیں۔ بلکہ اس کے
بتائے ہوئے راستے پر چل کر منزل قریب لانے کی کوشش
کرتا ہے۔ رہنما پر اعتماد اس کے سفر کا قیمتی اثاثہ ہوتا ہے
گمراہ انسان کی یہ کس قدر محرومی ہے کہ وہ عقل کی رہنمائی
میں آ جانے کے لیے بعد اس پر کلی اعتماد کر لیتا ہے لیکن اس پاک ذات پر اعتماد کرنے کے لیے
تیار نہیں ہوتا جس پر خود خدا تعالیٰ کو اعتماد ہے جسے
قدرت نے اپنا معتمد علیہ بنا کر بھیجا ہے۔ حتیٰ خودی
زندگی کا بار نہیں کرتی بعثت بعد موت اور اخروی

زندگی میں پیش آنے والی حقیقتیں اس کے نزدیک ایک افسانہ
کی حیثیت رکھتی ہیں اور خدا تعالیٰ کا بھیجا ہوا رسولؐ ان کی صداقت
کی گواہی دیتا ہے۔

وہ کہتا ہے جنت اور دوزخ حق ہیں میں نے انہیں دیکھا ہے
نیک اعمال کی جزا پانے والوں کی راحت و سکون کی زندگی کا بھی
میں نے مشاہدہ کیا ہے اور ان بد نصیب اور محروم القسمت انسانوں
کو بھی دیکھا ہے جو اپنی بد اعمالیوں کی بدولت عذاب الیم کے مستحق
بن چکے ہیں۔

کسی ملک کے متعلق اس شخص کے مشاہدات معتبر ہوتے ہیں جس نے
اس کی سیر کی ہو جس نے اس کا قریب سے مطالعہ کیا ہو شنید کی بات قابل
قبول نہیں ہوتی۔ مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے جزا اور سزا کا جو تصور پیش
کیا ہے، انسان کے آخری ٹھکانے کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں،
ان کے متعلق ان کا علم یقینی ہے مشاہدے پر مبنی ہے۔ یقین کے مقابلے
میں ظن و قیاس کے گھوڑے دوڑانے والی عقل کے فیصلوں کی کیا
حقیقت ہے؟

حقیقت سے شناسائی اس ذات سے مل کر ہو گی جو حقیقت
شناس ہے جس نے تمام حقیقتوں کو بے حجاب اور بلے

پردہ دیکھا ہے جس سے حقیقت کبریٰ کے چہرے کی نقاب اٹھ گئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔ نہ آنکھ جھپکی، نہ چکرائی۔ بلکہ مدامغ کا سرمہ لگنے کے بعد اور زیادہ روشن ہو گئی۔ عقل کا بیان پایندہ ہے۔

امتحان گاہِ محبت

محبت ہمیشہ سود و زیاں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ سود و زیاں کے جو پیمانے دنیا نے قائم کر رکھے ہیں وہ اس کے نزدیک مہمل ہوتے ہیں اس کی نظر میں ہر وہ چیز سود مند ہے جو اسے منزل تک پہنچا دے خواہ وہ کتنی ہی اذیت ناک اور تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔ ہر وہ چیز نقصان دہ ہے جو دوریٔ منزل کا پیام ہو۔ مادی اعتبار سے خواہ وہ کتنی ہی آرام دہ اور اطمینان بخش کیوں نہ ہو۔

محبت چونکہ خالصتاً ایک روحانی کیفیت ہے اس لیے وہ مادی زکاوٹوں کو برداشت نہیں کرتی کیونکہ مادی نقطۂ نگاہ سے ہر عمل خالصتاً ذہنی ہوتا ہے۔ محبت کا تصور اس سے بہت بلند ہے اغراض کی گرد بھی اس کے دامن کو نہیں چھو سکتی۔

ذاتی اغراض سے کر جو لوگ محبت کی راہ میں قدم رکھتے ہیں ان

کے پیش نظر سہولتیں رہتی ہیں، وہ ہر ایسا اقدام کرنے سے گریز کرتے ہیں جس سے ان کے مفاد کو معمولی سا نقصان پہنچنے کا بھی احتمال ہو۔ لیکن جن کی یہ فطرت نہیں وہ سب کچھ نثار کرنے کے جذبے سے کر گزرتی ہے۔ راستے کٹھن ہوتے ہیں، راہ طویل ہوتی ہے تو ہمت نہیں ہارتی بلکہ اس پر شباب آتا ہے۔ سرشاری کا عالم طاری ہوتا ہے۔ طبیعت میں ایک نئی امنگ اور ترنگ پیدا ہوتی ہے۔ جذبات نئے جوش و خروش کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ پروانے اور عشق کی فطرت جداگانہ ہے۔ ایک کی حیات تب و تاب میں ہے۔ شمع کے سامنے جل کر خاک ہو جانا پروانے کے عشق کی معراج ہے۔ مسلسل تڑپنے، رقص کرنے اور جان دینے میں اسے جو مزا آتا ہے وہ ہزار فلسفہ بگھارنے سے بھی کسی کتابی نسخے ذہن نشین نہیں کرایا جا سکتا، اور نہ ہی دلائل کے ذریعہ اس کیفیت سے آشنا کیا جا سکتا ہے۔ جذبۂ فدائیت تو ایک فطری چیز ہے۔ محبت کا فیضان ہے۔ محبت کے بغیر اسے کیسے سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔ عشق و محبت کی دنیا میں جب عقل کا کبھی گزر نہیں ہوا تو منطق سے جو جیالے اپنے گرد و پیش پر [illegible] خیال سے تجربات [illegible] کی توفیق نہیں [illegible] تو وہ [illegible] سے تشبیہ دے [illegible] عشق ہے۔

کسی حقیقت سے آگاہی تو اس میں مبتلا ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے تماشائیوں کو کب رازِ محبت معلوم ہوا ہے۔ وہ تو دور کھڑے ہو کر قیاس آرائیوں سے کام لینے کے عادی ہوتے ہیں حجاب میں پیدا ہوتے ہیں اور حجاب ہی میں مر جاتے ہیں۔ لذتیں، کیفیتیں اور سرشاریاں تو ان خاصانِ بارگاہ کا حصہ ہوتی ہیں جنہیں قدرت نے عشق کی دولت سے نوازا ہوتا ہے۔ عشق نہ ہو تو ایثار مشکل ہو جاتا ہے۔ عشق ہو تو جان دینا بھی آسان ہو جاتا ہے جب تک سب کچھ نثار نہ کیا جائے چین نہیں پڑتا۔

ناکامی اور کامیابی کے مادی نظریہ کو عشق کی صداقت نے یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ مادہ پرست تو تھوڑا سا نقصان بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اور عشق خواہ صدقِ خلیلؑ کی صورت میں ہو یا صبرِ حسینؑ کی صورت میں تمام نقصانات کو بہ رضا و رغبت برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ نہ آتشِ نمرود اس کی حرارت چھین سکتی ہے اور نہ ہی یزید کی شقاوت اس کے ارادہ کو متزلزل کر سکتی ہے۔

سہولتوں کے سامان دونوں جگہ ہوسکتے تھے امتحانِ خلیلؑ کے وقت بھی، امتحانِ حسینؑ کے وقت بھی، لیکن عشق نے کسی سہولت کو کب قبول کیا ہے۔ یہ عافیتیں تو ہوس طلب کرتی ہے۔ عشق کی منزل

ان پستیوں سے بہت بلند ہوتی ہے۔ وہ امتحان گاہِ محبت سے کامیاب ہو کر نکلتا ہے تو کونین کی عظمتیں اس کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرتی ہیں۔

تپش و گداز

جس چراغ میں لو آجاتی ہے، وہ پروانوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے اور جو دل خدا کی یاد میں جلتا ہے، اس پر خدا کی رحمت نثار ہونے لگتی ہے۔ بجھے ہوئے چراغ کے گرد پروانوں کا رقص نہیں ہوتا، اور بجھے ہوئے دل کا رحمت طواف نہیں کرتی۔ طواف اسی دل کا کرتی ہے، جس میں نور و روشنی ہو۔

جلتے چراغ دوسروں کو ٹھوکر سے بچاتے ہیں، منزل کا سراغ دیتے ہیں اور جلتے دل ایمان کی حرارت بخشتے ہیں۔ محبت سفر میں مسافر کی تھکن دور کرتا ہے۔ اسے مشتعل کر کے سفر کیلئے تازگی بخشتا ہے۔ دل کا نغمہ بھی شعلے کے مانند سفر کے لیے مشعل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے تھکن بھی دور ہوتی ہے اور قدم بھی تیز اٹھنے لگتے ہیں۔ مردہ سینے سے نغمے کی توقع نہیں کی جا سکتی، اور مردہ دل محبت کے جذبات کا حامل نہیں بن سکتا۔ زندہ دل کے سینے سے وجد آگیں نغمات پھوٹتے ہیں، اور زندہ دل [illegible] کی گرمی محسوس کرتا ہے [illegible] پانی بن کر تحلیل ہو جاتا ہے۔

پتھر تحلیل نہیں ہوتا اس میں تحلیل ہونے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔
اثر قبول کرنے کے لیے صلاحیت درکار ہوتی ہے، ابوجہل
میں صلاحیت نہ تھی، وہ جمال دیکھنے کے بعد بھی محروم رہا۔ اور
صدیق کے دل میں چونکہ صلاحیت موجود تھی اس لیے
پگھل گیا۔ گداز ہوگیا۔

سورج کی گرمی پھلوں میں رس اور مزہ پیدا کر دیتی ہے لیکن
حشرات الارض اسی گرمی سے مرجاتے ہیں۔ یہی گرمی ایک کے لیے زندگی
کا پیام ثابت ہوتی ہے اور ایک کے لیے پیام مرگ بن جاتی ہے۔
چراغ کی لو خواہ کتنی بھی تیز ہو فطری سوز سے محروم پتنگوں کو جذب
میں نہیں لا سکتی۔ رقص اور وجد پروانوں ہی کا حصہ ہوتا ہے۔ سوز
بھی وہی حاصل کرتے ہیں۔ اور نثار بھی وہی ہوتے ہیں۔ پروانہ صرف چراغ
کی لو کے گرد ہی طواف نہیں کرتا مٹی کے اس چراغ میں تیل ہو اس کا بھی
طواف کرتا ہے۔ دل بھی تو اسی سے فیض یاب ہوا تو رحمت اسی کا طواف
نہیں کرتی خاک کے پتلے کا بھی طواف کرنے لگتی ہے۔ بتی کے بغیر چراغ
روشن نہیں ہو سکتا چراغ کی ساری لو اس بتی کی منت پذیر ہوتی ہے
جو تیل اور لو کے درمیان واسطہ بنی ہوتی ہے۔

نیاز سے کوئی نسبت [illegible]

روشنی پیدا ہونے لگتی ہے۔ محبت کا تعلق کے ذریعے
نور بن کر ظاہر ہونے لگتا ہے اور آخرت کی منزل کے مسافر
کو اس راہ پر فروزاں اور تاباں نظر آنے لگتی ہیں۔ محبت
ہی نہ ہو تو جب کہ موت تعلق ہی نہ ہو تو شعلہ بن کر فروزاں
کون ہو گا زندگی کی راہوں میں نور کون پھیلائے گا تاریکیاں
تو نور سے منور ہیں نہ ظلمتیں تو روشنی سے دور ہوتی ہیں تپش
در گداز بھی جلنے کے بعد ہی حاصل ہوتے ہیں۔ جلنا اور
جلانا، نور حاصل کرنا اور نور بخشنا زندگی کا مقصود بن چکا
ہو تو یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ سامان ناگزیر ہو
جاتا ہے جو جلنے جلانے، روشنی حاصل کرنے اور روشنی پھیلانے
کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر نہ روشنی ملتی ہے اور نہ تپش و گداز
کی لذت سے آگاہی حاصل ہو سکتی ہے

بندہ نوازی

[illegible]
[illegible]

اس کے پتوں کو کھا گئے ہیں، یہ سن کر فرمانے لگے کہ اس دور کے کسی عالم دین کا انتقال ہو جائے گا۔ سفید پرندوں سے مراد فرشتے ہیں اور گھنا درخت کوئی ایسا عالم دین ہے جس کے سائے میں تپتی ہوئی روحوں کو آسودگی ملتی تھی۔ چنانچہ زیادہ وقت نہ گذرا تھا کہ امام حسن بصریؒ کے انتقال کی خبر آگئی جو اپنے وقت کے یگانۂ روزگار عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ حجاج بن یوسف جیسے ظالم اور سفاک حکمران کی ستائی ہوئی مخلوق کے لیے تسکین کا سامان فراہم کر رہے تھے۔ جس مظلوم کو اپنا غم سننے والا اور تسکین دینے والا مل جائے وہ خوش نصیب ہوتا ہے۔ مقابلہ تو اس انسان کی محرومی ہوتی ہے جس کا سینہ زخموں سے معمور ہو اور اسے آنسو پونچھنے والا دامن نہ مل سکے۔ بعض اوقات جب دل پر غم و آلام کے بادل چھائے ہوتے ہیں اور شدت یاس میں چاروں طرف ظلمتوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تو پرسش غم بھی مداوا سے کم نہیں ہوتی۔ چند تسلی آمیز الفاظ سن کر بھی انسان کی ڈھارس بندھ جاتی ہے اور اسے مستقبل کے افق پر کئی نئی بہاریں فروزاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اسی سبب [illegible] [illegible] [illegible]

بن سکتا ہے۔ احساس کی دولت سے سینہ معمور ہو تو دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے تسلی کے چند الفاظ بھی دکھیاروں کے لیے مرہم ثابت ہوتے ہیں۔ شقی انسان جو فطرتاً رحم و کرم کے جذبات سے محروم ہو۔ وہ کسی انسان کو جھوٹی تسلی بھی نہیں دے سکتا اور خدا تعالیٰ کے مقبول بندے جو کسی کی مدد نہ بھی کر سکیں، زبانی ہمدردی سے دریغ نہیں کرتے۔ شقاوت جب خود خدا تعالیٰ کے عذاب کی لپیٹ میں آجاتی ہے تو تنکوں کا سہارا تلاش کرتی ہے۔

جو انسان عذاب کے طور پر مصیبت میں مبتلا نہ کیا گیا ہو، بلکہ اس کی یہ مصیبت درجات کی بلندی اور آزمائش کی حیثیت رکھتی ہو اسے تسکین دینے والے مل جاتے ہیں۔ شقی انسان کی مصیبت پر کسی کا دل نہیں کڑھتا۔ کسی کی آنکھ نمناک نہیں ہوتی اور کوئی ہاتھ اس کے آنسو پونچھنے کے لیے نہیں بڑھتا ہے۔ غرض ہر کسی آنکھ کی نمناکی اور کسی کا قلق و اضطراب خدا کی رحمت ہوتا ہے۔ خدا کی رحمت سے دل میں رحم و کرم کا جذبہ پیدا نہ ہو تو کون کسی کے غم میں روتا ہے، کون کسی کو دیکھ کر پریشان ہوتا ہے۔ یہ سب خدا کی نعمتیں ہیں۔ بندہ نوازی کے انداز ہیں اور کبریائی کی شان ہے جس سے شقاوت ہمیشہ محروم رہتی ہے۔

بصیرتیں

جن نفوسِ قدسیہ کو خدا تعالیٰ نے اپنے دین کی نصرت و حمایت کے لیے صبحِ ازل چن لیا تھا اور وہ نبوت کے مخاطبِ اوّل قرار پائے تھے۔ ان کا ہر قول و فعل زندگی کی شاہراہوں میں مشعلِ ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ مسائل جو ان کے سامنے آئے تھے اور ان کے حل بھی ظلمتوں میں مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

صحابہ کا امت پر یہ بھی کرم کیا کم ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً حضورؐ سے دقیق مسائل کے متعلق استفسار فرماتے رہتے تھے۔ حضورؐ ان کے سوالات کے جو جواب دیتے تھے وہ پوری امت کے لیے فوز و فلاح کے ضامن ہیں۔

صحابہؓ کی توجہ اپنی ذاتی مسائل کی الجھنوں کے حل کرنے پر مرکوز نہ تھی۔ حضورؐ سے وہ جو سوال بھی کرتے تھے وہ نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود سے متعلق ہوتا تھا۔ ایک دن حضورؐ کہیں تشریف لا رہے تھے۔ حضرت [illegible] نے عرض کیا: یا رسول اللہ کسی آنکھوں دیکھے کوئی عجیب واقعہ بیان فرمائیے۔

حضورؐ نے فرمایا اگلے زمانے کے تین آدمی مل کر سفر کو روانہ ہوئے شام کو انہیں پناہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ تو انہوں نے ایک غار میں قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا غار میں وہ قیام پذیر تھے کہ ایک پتھر گرنے کے باعث غار کا منہ بند ہو گیا اور ان کے باہر نکلنے کی راہ مسدود ہو گئی ان میں سے ایک نے کہا کہ نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی اور اب ہماری موت یقینی ہے۔ ایک تجویز میرے ذہن میں آئی ہے کہ ہم میں سے جس شخص نے کوئی نیک عمل کیا ہے اسے وسیلہ بنا کر خدا کی بارگاہ میں دعا مانگے کہ وہ ہمیں نجات دے۔

چنانچہ یہ تجویز پسند کر لی گئی۔ اور ان میں سے ایک بولا کہ میرے ماں باپ بہت ضعیف تھے۔ میں انتہائی مفلس تھا۔ میرا معمول یہ تھا کہ جنگل سے لکڑیاں لا کر فروخت کرتا اور اس کی قیمت سے غذا لا کر ان بکریوں کے دودھ میں بھگو دیتا۔ جو میرے پاس موجود تھیں۔ غذا نرم ہو جاتی تو بوڑھے ماں باپ کو کھلاتا۔ ایک دن مجھے لکڑیاں لانے میں دیر ہو گئی جب میں نے غذا کو دودھ میں بھگونے کے بعد نرم کی اور میں اپنے والدین کو کھلانے کے لیے گیا تو وہ سو چکے تھے مجھے سخت قلق ہوا۔ اور میں غذا کا پیالہ لے کر ان کے پاس کھڑا ہو گیا ان کے بیدار ہونے کے انتظار میں صبح تک کھڑا رہا۔ وہ سو کر اٹھے تو میں

سے نے غذا پیش کی۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اس نے کہا کہ ہماری ظاہری اور باطنی کیفیات کو جاننے والے قادر و قیوم۔ اگر میں اپنے اس بیان میں صادق ہوں تو ہمیں اس مصیبت سے نجات عطا فرما۔ حضور علیہ السلام نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اس شخص کی دعا خدا نے قبول کی اور غار کے دہانہ سے تھوڑا سا پتھر سرک گیا۔ لیکن سوراخ اتنا نہ تھا کہ وہ باہر نکل سکتے۔

حضورؐ نے فرمایا ان میں سے دوسرے نے کہا۔ مجھے اپنی چچازاد بہن سے عشق تھا۔ لیکن وہ میری طرف التفات نہ کرتی۔ ایک دفعہ میں نے اسے حیلوں بہانوں سے راضی کر لیا۔ اور ایک معقول رقم بھی پیش کی جب وہ رات کے وقت میری خلوت میں آئی اور میں نے بدی کا ارادہ کیا تو میرے دل پہ خدا کا خوف غالب آ گیا اور مجھے خدا نے معصیت سے محفوظ رکھا۔

حضورؐ نے فرمایا کہ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اس نے خدا سے نصرت چاہی اور پتھر تھوڑا سا اور سرک گیا لیکن ابھی تک وہ باہر نہیں نکل سکتے تھے۔

تیسرے نے کہا کہ میرے ہاں کچھ مزدور کام کرتے تھے۔ ان

میں سے ایک مزدور اجرت لیے بغیر چلا گیا۔ میں نے اس کی بہت تلاش کی لیکن وہ نہ ملا۔ اس کی اجرت کے پیسوں سے میں نے ایک بھیڑ خرید لی۔ اور چند سال تک اسے اپنے پاس رکھا۔ اس دوران میں اسکے متعدد بچے پیدا ہوئے۔ انہیں بھی اسکے ساتھ شامل کیا۔ چند سال بعد مزدور نے آکر مجھ سے اجرت کا مطالبہ کیا۔ تو میں نے ان بھیڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تمہاری اجرت یہ ہے لیکن میں نے اسے تسلی دے کر یہ تمام بھیڑیں اس کے حوالے کر دیں۔

آنحضرت نے فرمایا کہ اپنے اس عمل کا ذکر کرنے کے بعد اس نے دعا مانگی تو وہ قبول ہو گئی اور غار کا پتھر سرک گیا۔ اور وہ تینوں باہر نکل آئے۔ یہ حدیث احادیث کے مجموعوں میں حدیث الغار کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں جو بصیرتیں پوشیدہ ہیں۔ وہ اہل دل سے پوشیدہ نہیں۔

پرویزی حیلے

ایک صاحب جو بڑے طمطراق سے پرویزی شان دکھانے کے لیے اٹھے ہیں۔ ان بزرگانِ دین سے بہت ناراض ہیں۔ انہوں نے

حدیث نبوی کی تدوین و ترتیب کی ہے اور حق کے فروغ کے لیے جانکاہیوں سے کام لیا ہے۔ محدثین کو یہ عجمی سازش کا شکار بتاتے ہیں اور بزرگانِ دین سے ان کی برہمی کا باعث یہ ہے کہ انہوں نے اپنا نام صوفی رکھ لیا تھا۔ حالانکہ یہ نام صدرِ اوّل میں نہیں تھا۔

نام کی بحث میں الجھنا کوئی معقولیت نہیں کیونکہ بہت سی ایسی حقیقتیں ہیں جو صدرِ اوّل میں پائی جاتی تھیں۔ اس وقت ان کا نام نہ تھا۔ اب اور نام سے موسوم ہیں۔ نماز، روزہ بھی عربی الفاظ نہیں۔ یہ خالصتاً عجمی ہیں۔ لیکن کیا کوئی معقول آدمی ان کے نام کی تبدیلی کے باعث ان سے انکار کر سکتا ہے؟ اسم کا انکار مسمّٰی کے انکار کو مستلزم نہیں ہوتا کیونکہ اسم اور مسمّٰی ایک چیز نہیں۔ اسم کے انکار سے مسمّٰی کی حقیقت کو نہیں جھٹلایا جا سکتا۔ ورنہ چاہیے۔ لفظ یزید ہی کو لے لیجیے۔ یہ ہماری ملّی تاریخ کا ایک مکروہ ترین لفظ ہے۔ یزید اس شاتمِ رسولؐ بادشاہ کا نام تھا جس نے رسولِ کریمؐ کا [illegible] کر دیا تھا اور وہ عتابِ نبوت کا مورد بنا تھا۔

لہٰذا محدث اور صوفی پہ بگڑنے والے ایک دشمنِ رسولؐ کے نام کو تو برداشت کر لیتے لیکن انہیں حدیث اور صوفی کے نام سے کد ہے۔ ان کے خلاف یہ کہہ کر سارا زورِ قلم صرف کر رہے ہیں کہ تصوف

نے اسلام کی کوئی خدمت نہیں کی۔

ان کرم فرماؤں کے نزدیک اگر خدمتِ دین کا مفہوم یہ ہے کہ ان بزرگوں نے کوئی ماہنامہ جاری کر کے اپنے اسلاف کی عظمتوں کو مٹانے کی کوشش نہیں کی۔ انہیں عجمی سازشوں کا شکار نہیں قرار دیا۔ غیر مسلم حکومت کے ایک ایسے شعبے کا انچارج بننا قبول نہیں کیا جس کے ذمے ملت کی مخبری کے فرائض تھے، بے پردہ اور نیم عریاں خواتین میں بیٹھ کر اسلام کی نئی تعبیر و تفسیر نہیں کی۔ تو ہمیں اعتراف ہے کہ ان کا دامن ان خدمات سے خالی ہے۔ ان کے تقوے کا تو یہ عالم تھا کہ کافرانہ نظام کا کل پرزہ بن کر ملت کی مخبری کرنا تو ایک طرف، زیادہ تر مسلمان حکمرانوں کی بارگاہوں میں قاضی بننا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ ایسے مناصب کو استحقار سے ٹھکرایا۔ وہ حق گوئی کے جرم میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ اپنی پشتوں پہ درّے کھائے ہیں۔ لیکن زبان کو باطل کی تائید میں نہیں کھلنے دیا۔ حق کی تائید و حمایت کے لیے جو ذرائع بھی ان کے امکان میں تھے نہیں بروئے کار لائے ہیں جہاد کا وقت آیا تو دنیا نے انہیں مختلف محاذوں پر دادِ شجاعت دیتے ہوئے دیکھا۔ رزم گاہوں میں ان کی تلواریں چمکیں۔ ان کے عزائم نے باطل کے پرچم کے نیچے کھڑے ہو کر لڑنے والے جانبازوں کے عزائم

کو شکست دی۔ فکر و تدبیر کا وقت آیا تو ان کی فکر صائب ثابت ہوئی۔ ان کے ناخنِ تدبیر نے لاینحل عقدے کھولے اور انہی کی فکر کی رہنمائی میں ملت قافلہ اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ ہمارے دامن میں فکر و خیال کا جو بھی سرمایہ ہے۔ جسے ہم اپنی قیمتی متاع سمجھتے ہیں، اور جس کی تابندگی و تابانی ہمیں فکر و خیال کی لغزشوں سے محفوظ رکھتی ہے، یہ انہی کی عطا ہے۔ انہی کا کرم ہے، انہی کی نوازش ہے۔ یک کور چشم کو آفتاب کی تابانی نظر نہ آئے تو یہ آفتاب کا قصور نہیں۔ بصارت و بصیرت سے محرومی انسان کو ہی زندہ و پائندہ حقیقتوں کا انکار کر دیتی ہے۔

چند مظاہر

میر و سلطان کی بارگاہ میں حق بات کہنا بڑا مشکل کام ہے۔ جب کسی صاحبِ اقتدار کے سامنے اس کی خواہشات کے علی الرغم حق بات کہنے کا مرحلہ پیش ہو تو یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ایمان اگر محکم نہ ہو، خدا کی توفیق شاملِ حال نہ ہو، تو انسان اس مرحلے سے آسانی سے نہیں گزر سکتا۔

بندے کا تقویٰ جب خشیتِ الٰہی بن جاتا ہے تو اسے اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کے حق بات کہنے سے اقتدار کی جبیں پر شکن

پڑنے کا اندیشہ ہے جان کا خطرہ مول لے کر بھی وہ یہ فریضہ ادا کرتا ہے۔

جن دنوں امام محمدؒ قاضی القضاۃ تھے۔ انہیں بار بار ان مراحل سے گزرنا پڑا۔ لیکن مطلق العنان شاہ کی برہمی کا خیال انہیں حق گوئی سے باز نہ رکھ سکا۔

ایک دفعہ ہارون رشید نے ان سے کہا کہ حضرت عمر فاروق نے بنو تغلب سے اس شرط پر مصالحت کی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو عیسائی نہیں بنائیں گے لیکن وہ اس شرط پر قائم نہ رہے بلکہ انہوں نے اپنی اولاد کو عیسائی بنا لیا۔ تو کیا انکی بدعہدی کے باعث ان کا خون بہانا جائز ہے؟ (امام محمدؒ نے فرمایا:)

یہ درست ہے کہ بنو تغلب اپنے عہد پر قائم نہیں رہے۔ انہوں نے اپنی اولاد کو عیسائی بنا لیا تھا۔ لیکن حضرت عثمان نے چونکہ ان سے تعرض نہیں کیا۔ اس لیے ان سے تعرض کرنا درست نہیں۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ کو کتاب و سنت کا جو علم تھا، وہ ہمیں نہیں۔ خدا اور رسول کی منشا کو وہ ہم سے زیادہ سمجھتے تھے۔ ان کے بعد اسی فیصلے کو برقرار رکھا گیا۔ اس لیے اب اگر آپ ان کا خون بہائیں گے، تو یہ صریحاً ظلم ہوگا امام محمدؒ کی حق گوئی کا یہ اثر ہوا۔ کہ بنو تغلب کی جان بچ گئی۔ اور ہارون رشید نے اپنا فیصلہ بدل لیا۔

ہارون رشید کو ایک دفعہ یہ اطلاع ملی۔ کہ کچھ لوگوں نے اس

کے خلاف شورش برپا کر رکھی ہے۔ اور وہ عوام کو اس کی حکومت کے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ اس نے انہیں گرفتار کرنے کے لیے ایک فوجی دستہ روانہ کیا۔

باغیوں کو پکڑ کر بغداد لایا گیا۔ ہارون رشید کا قیام چونکہ ان دنوں رقہ تھا، اس لیے باغیوں کو رقہ بھیج دیا گیا۔

جب ہارون رشید کے سامنے انہیں پیش کیا گیا، تو اس وقت امام محمد بھی قاضی القضاۃ کی حیثیت سے اس کے قریب بیٹھے تھے امام محمد یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ باغیوں کی جماعت میں حضرت امام شافعیؒ بھی ملزم کی حیثیت سے موجود ہیں۔

ہارون رشید نے ایک ایک ملزم سے بہ پوچھنے کے بعد کہ تم نے میرے خلاف بغاوت کیوں کی۔ انہیں قتل کرا دیا۔

اب امام شافعی کی باری تھی۔ ہارون رشید نے جب ان سے پوچھا کہ تم نے بغاوت کیوں کی تو انہوں نے فرمایا کہ میں باغی نہیں اور نہ ہی مجھے ایسی سازشوں سے فطرتاً کوئی لگاؤ ہے میرا طبعی میلان علوم دینیہ کی نشر و اشاعت کی طرف ہے سپاہی مجھے کسی غلط تاثر کی بنا پر پکڑ لائے ہیں۔

امام شافعیؒ نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا: یہ صاحب

جو قاضی القضاۃ کی حیثیت سے آپ کے پاس بیٹھے ہیں، مجھے جانتے ہیں، ان سے پوچھ لیجیے، میں باغی نہیں۔

ہارون رشید نے امام محمد کی طرف توجہ کر کے سوال کیا آپ کی ان کے متعلق کیا رائے ہے؟

امام محمد نے فرمایا۔

"یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، صحیح ہے۔ اپنی دینی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے انتہائی کسرِ نفسی سے کام لیا ہے۔ ان کا علمی پایہ بہت بلند ہے۔ اور ان کا وجود ملت اسلامیہ کے لیے ایک نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ باغیوں کو سزا کا حکم دیتے وقت ہارون رشید بہت غضب ناک تھا لیکن امام محمد نے پورے خلوص اور دیانت کے ساتھ ان کے اوصاف بیان کئے اور انہیں بچا لیا۔

ہارون رشید کی رضاجوئی کی نسبت، امام محمد کے نزدیک امام شافعیؒ کا خون زیادہ قیمت رکھتا تھا۔

امام شافعیؒ سے امام محمدؒ کی یہ دلچسپی دیکھ کر ہارون رشید نے امام محمد سے کہا کہ اچھا آپ انہیں اپنے ساتھ لے جایئے۔ ان کے ذمہ دار آپ ہیں۔

امام شافعیؒ کو نجات دلانے کے بعد امام محمد نے مدتوں انہیں اپنے پاس رکھا۔

بوترابی حکمتیں

حضرت علیؓ سے کسی نے کہا، کہ مسئلہ جبر و قدر پر روشنی ڈالیے چنانچہ انہوں نے فرمایا کھڑے ہو جاؤ!

سائل کھڑا ہو گیا، تو آپؓ نے فرمایا ایک ٹانگ اٹھا لو! اس نے ایک ٹانگ اٹھالی تو بولے کہ دوسری بھی اٹھا لو! اس نے جواب دیا، کہ دوسری کیسے اٹھا سکتا ہوں، دوسری اٹھائی تو گر جاؤں گا۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہی جبر و قدر ہے۔ بعض امور کا تجھے اختیار دیا گیا ہے اور بعض تیرے اختیار میں نہیں۔ قیامت کے دن محاسبہ انہی امور کے متعلق ہو گا جو تیرے اختیار میں ہیں، غیر اختیاری امور کے متعلق سوال نہیں ہو گا۔

حضرت علیؓ مکان کی چھت پر کھڑے تھے، نیچے سے ایک یہودی گزرا جس نے میر علیہ السلام کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا کہ موت کا وقت مقرر ہے!

آپ نے اثبات میں جواب دیا۔ تو وہ بولا، کہ موت وقتِ مقررہ پر آئے گی تو مکان کی چھت سے چھلانگ لگا دو آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔

امیر علیہ السلام نے جواب دیا کہ چھت سے گر کر مرنا اگر میرے مقدر میں نہیں تو میں گرنے کے بعد بھی زندہ رہوں گا۔ لیکن مجھے خدا تعالیٰ پر کامل یقین ہے اور مجھے اپنے مولا کو آزمانے کی ضرورت نہیں۔ ایسا تجربہ تجھے کرنا چاہیئے مجھے تو تجربے کی ضرورت نہیں۔ میں تو اپنے مولا کو قادرِ مطلق سمجھتا ہوں۔

ایک دفعہ امیر علیہ السلام کی موجودگی میں بعض علمی مباحث چھڑ گئے۔ ایک شخص نے عقل و نقل کی بحث کا آغاز کر دیا۔ اس کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مذہبی امور عقل کے مطابق ہیں۔

امیر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کس کی عقل کے مطابق؟ تمہاری عقل کے مطابق؟

اور پھر سائل پر اس کی غلطی واضح کرنے کے لیے دیکھو کہ شریعت نے موزے پر مسح کرنے کا حکم دیا ہے حالانکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ موزے کے نیچے مسح کیا جائے تاکہ چلنے پھرنے سے جو غلاظت لگ گئی ہو وہ دور ہو سکے۔ لیکن شریعت ہماری عقل کی پابند نہیں۔ موزے کے نیچے مسح کرنے کی بجائے اوپر مسح کرنے کی مصلحتیں ہماری سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، وہ ایک زندہ و پائندہ حقیقت ہیں۔ ان سے انحراف ممکن نہیں۔

امیر علیہ السلام نے موزے پر مسح کرنے کی جو مثال پیش کی ہے وہ

عقل کے بندوں کو جھنجھوڑنے اور ربانی حکمتوں کی اہمیت واضح کرنے کے لیے کس قدر اہمیت رکھتی ہے! امیر علیہ السلام اور ان کی طرح کے فکرِ سلیم رکھنے والے بزرگوں کو کبھی موزے پر مسح کرنے کے متعلق کوئی اشکال پیدا نہیں ہوا۔ اشکال وہیں پیدا ہوتا ہے۔ جہاں دوسری ذات کو ناقص سمجھا جاتا ہے۔ کامل ذات کے ... لیے گئے امور کی حکمت و مصلحت تک ذہنِ انسانی کی رسائی ہو یا نہ ہو، وہ ان کے متعلق کبھی شک و شبہے میں مبتلا نہیں ہوتا۔ شک و شبہ دل میں جگہ پانے لگے۔ تو اس کا یہ مفہوم ہوتا ہے۔ کہ انسان اپنے سامنے والی ذات کو کامل نہیں سمجھتا۔ اور اسی کا نام اسلامی اصطلاح میں کفر ہے۔ ایمان راسخ ہو جائے تو شک و شبہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ ہجرت ... کے وقت امیر علیہ السلام بسترِ رسول پر ... تھے تو کوئی شبہ ان کے قریب نہیں پھٹک سکا۔ انہیں خطرات میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود بسترِ رسول پر نیند آگئی۔ یہ محبت ہی کا خاصا ہے کہ وہ خطرات میں گھر کر بھی اطمینان کی نیند سو سکتی ہے۔ عقل کو ایسے وقت کہاں نیند آسکتی ہے؟ اسے تو معمولی خطرہ بھی بے چین کر دیتا ہے بلکہ وہ تو ازل ہی سے بے چین ہے اور بے چین رہے گی۔

عید اور فطرانہ

مومن کو ہر نعمت کے حصول کے بعد شکر کی تلقین کی گئی ہے عید کے دن مسلمان عید گاہ میں جمع ہو کر جو سجدہ ریز ہوتے ہیں دراصل یہ اس نعمت کا شکر ہوتا ہے جو ہمیں روزوں کی صورت میں عطا ہوئی بخشش و رحمت کے اس مہینے میں جو بادل گھر گھر برسے اور دلوں کو نئی زندگی عطا کر گئے اس کی خوشی کا نام عید ہے

اس سے بڑھ کر اور خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ بندہ اطاعت کی راہ سے گزر کر اپنے مولا کی منزل میں داخل ہو جائے قدم قدم پر جس کی خوشنودی کی سند ملتا ہو، مہینہ بھر بھوکا پیاسا رہ کر خواہشات کو قربان کرنے کے بعد مسلمان جب عید گاہ کی طرف نکلتا ہے تو اس کا دل اس احساس سے لبریز ہوتا ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی طرف سے عائد کئے گئے فریضے کو ادا کرنے کے بعد اس کی بارگاہ کی حاضری دے رہا ہے۔

اعلیٰ بارگاہ میں حاضری کے وقت اعلیٰ لباس کی ضرورت ہوتی ہے اور آج بارگاہ صمدیت میں حاضری دینے والے غلام کا لباس ہی ستھرا نہیں، مسلسل ایک ماہ کے روزوں اور قیام لیل نے اس کی باطنی کدورتوں کو بھی دھو ڈالا ہے۔

ظاہر کو دیکھنے والی کی بارگاہ میں صاف ہونا ضروری ہوتا ہے اور جس قادر وقیوم
کی نگاہ سے باطن کی کوئی کیفیت و حرکت پوشیدہ نہ ہو اس کی بارگاہ میں ظاہر
کے ساتھ باطن کا پاک صاف ہونا بھی ناگزیر ہوتا ہے۔

جن لوگوں نے خلوص نیت کے ساتھ روزے رکھے اور ان کے
تمام شرائط و لوازم کو پورا کیا ان کے دل معصیت کی اس گرد
سے پاک ہو چکے ہیں جو گناہوں کے باعث ان کے قلب کو محیط
تھی ایسے ہی لوگ عید کی حقیقی مسرتوں کے مالک ہیں ظاہر کے
ساتھ انہوں نے باطن کو بھی کرم کے قابل بنا لیا ہے اور ایسے ہی لوگ
قابل رشک ہیں۔ برستے بادلوں میں جو شخص اپنے چہرے کا گرد و غبار نہ دھو سکے
وہ قابل ستائش نہیں موسلا دھار بارش میں چہرے کی سیاہی سے رنگ کر لوٹنے
والا مسافر انتہائی محروم القسمت ہوتا ہے اور جو لوگ رحمت کی برکھا میں
دل کے داغ نہیں دھو سکتے ان کی محرومی قابل ماتم ہوتی ہے۔ رحمت برستی ہی ڈوبتے
کو سہارا دینے اور ڈوبتوں کو بچانے کے لیے ہے۔ رحمت سے منہ موڑنے والا ہر
جگہ خائب و خاسر رہتا ہے۔

روزہ رکھ لینے اور عید کی نماز ادا کر لینے ہی سے وہ مقصد پورا نہیں ہو
جاتا جو خدا نے قرآن حکیم کے پیش نظر ہے روزوں کے ذریعہ خدا امت میں
تقویٰ کی شان پیدا کرنا چاہتا ہے اور تقویٰ فاقہ کشی کے ذریعہ ہی نہیں بلکہ

مال خرچ کرنے سے بھی حاصل ہوتا ہے اسی لیے بارگاہِ صمدیت میں حاضری سے قبل صدقۂ فطر ادا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

خدا تعالیٰ کی توفیق شامل حال نہ ہو تو انسان لاکھوں اور کروڑوں کا مالک ہونے کے باوجود خدا کی راہ میں ایک پیسہ خرچ کرنے سے بھی گریز کرتا ہے۔ توفیق نصیب ہو تو سب کچھ لٹا کر بھی ذوق کی سیرابی نہیں ہوتی صاحب ایثار چونکہ سب نہیں ہوتے اس لیے فطرہ کی بابت حقیر مقدار مقرر فرمائی گئی مقدار اگر پورے التزام کے ساتھ ادا کی جائے اپنے محلے کے غرباء مساکین بیوہ اور یتامیٰ کو ان کا وہ حق دیا جائے جو خدا نے صاحب نصاب روزہ داروں کے مال میں مقرر فرمایا ہے تو وہ بھی عید کی مسرتوں میں شریک ہو سکتے ہیں صدقہ فطر ادا کرنے سے ہمیں ان روزوں کا ثواب بھی حاصل ہو سکتا ہے جن سے قریب۔ جتنے کے باوجود ہم ان کے درد کی حالت سے بے خبر ہیں ہمیشہ بھوکا پیاسا رکھ کر امیروں کو غریبوں کی حالت کا احساس دلایا گیا ہے اور یہی مقصد فطرہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس تعلیم کو بھی کوئی نہ سمجھے تو خدا کو اس کے روزوں کی کوئی ضرورت نہیں۔

مردود اور مقبول

امام حسن بصریؒ جن دنوں اموی عہد میں مصیبت کے دن کاٹ رہے تھے، ان کے سامنے گوناگوں مشکلات تھیں۔ اموی حکام نے انہیں تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔ اور بصرے کے وہ شہدے اور کمینے بھی ان کے درپے آزار تھے جن کا بظاہر حکومت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ حسن بصریؒ کو اپنے تفنن کا موضوع بنا کر اپنے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کر رہے تھے۔ انہی شہدوں میں حسن بصریؒ کی بوڑھی ملازمہ کا جوان سال بیٹا بھی شامل تھا۔ جو ماں کی خواہشات کے علی الرغم حسن بصریؒ کو ایذا پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ ضعیفہ بے حد کبیدہ خاطر تھی کہ ہونہار کس ڈگر پر چل نکلا ہے؟ اسے تو حسن بصریؒ کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔

ضعیفہ کو جب یہ معلوم ہوتا کہ اس کا بیٹا شہدوں اور کمینوں کی محفل میں بیٹھ کر حسن بصریؒ کے تقدس کا مذاق اڑاتا ہے، ان جیسا لب و لہجہ تقلید کر کے ان کی نقل اتارتا ہے تو اس کا دل خون ہو جاتا ہے اور وہ بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کرتی لیکن نوجوان اپنے موقف سے ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو سکا۔

اس کی توجہ حسن بصری کو ایذا دینے ہی پر مرکوز تھی، اور اسے انہیں ایذا دینے ہی میں راحت محسوس ہو رہی تھی۔

اتفاق سے نوجوان بیمار ہو گیا، اور اس کی علالت نے شدت اختیار کر لی۔ کافی علاج معالجے کے بعد بھی شفا نہ ہوئی تو اس نے ایک دن کراہتے ہوئے اپنی والدہ سے کہا کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا یہ درد وکرب اور قلق و اضطراب خدا کے عذاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے حسن بصری کی مخالفت کی سزا مل رہی ہے جب تک مجھے وہ معاف نہیں کریں گے۔ مجھے شفا نہ ہو گی۔

نوجوان نے والدہ سے کہا کہ آپ حسن بصری کے پاس میری سفارش کریں۔ مجھ میں چلنے کی سکت ہوتی۔ تو خود حاضر ہو کر دعا کی درخواست کرتا لیکن معذور ہوں ضعیفت کے باعث دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔

نوجوان کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو دیکھ کر ماں پر رقت طاری ہو گئی اور اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ بیٹا! میں تو کہتی تھی کہ حسن بصری کو نہ ستا، وہ اس عہد کا مظلوم ترین انسان ہے، اموی حکام نے اس پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے لیکن تم نے میری بات نہ مانی۔

ضعیفہ نوجوان کے مظالم کے پیش نظر حسن بصری سے معافی طلب کرتے ہوئے گھبراتی تھی، لیکن بیٹے کی محبت اسے حسن بصری کی بارگاہ میں کھینچ لائی جب اس نے بیٹے کے لیے معافی طلب کی اور دعا کے لیے کہا تو حسن بصری

بولے کہ میری دعا تمہارے بیٹے کے حق میں ثابت نہیں ہو سکتی قبولیت اسی دعا کو ملتی ہے جس کا محرک محبت کا کوئی بے تاب جذبہ ہو میرے دل میں اس کی محبت نہیں، اسے کہو، جس سے محبت ہے اسی سے دعا کرائے۔

ضیعفہ حسن بصری کا پیغام لے کر بیٹے کے پاس پہنچی تو وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ شدت یاس میں بولا کہ اچھا میری یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، تو میری موت کے بعد میرے گلے میں رسی ڈال کر بازار میں گھسیٹنا اور لوگوں سے کہنا خدا کے مقبولوں کو ایذا دینے والوں کا یہ انجام ہوتا ہے

یہ کہنے کے بعد نوجوان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور اس کی تجہیز و تکفین کے لیے خدا تعالیٰ کے نیک بندوں کا ایک کثیر اجتماع ہو گیا ضعیفہ نے بیٹے کی آخری آرزو کا اظہار کیا تو ان لوگوں نے کہا، کہ یہ خدا تعالیٰ کا مقبول انسان تھا اس کی لاش کے ساتھ تشہیر کا تصور بھی غلط ہے اسی رات حسن بصریؒ سوئے، تو انہیں خواب میں کہا گیا کہ آج ہمارے دوست کا انتقال ہو گیا ہے آپ جنازہ کے لیے کیوں نہیں گئے، حسن بصری نے پوچھا کون سا دوست، حکم ہو کہ بدی لازمہ کا بیٹا حسن بصری بولے، وہ تو دشمن، میرے رب کا دوست کیسے بن گیا ارشاد باری ہوا کہ حبیب اس نے آخری وقت تم سے رحم و کرم کی بھیک مانگی تھی، اور تم نے اسے دھتکار دیا تھا تو وہ ہماری طرف متوجہ ہوا اس نے ہمیں پکارا، تو ہم نے اس کی فریاد سن لی۔ اب وہ مردود نہیں مقبول ہے۔

خالدؓ اور ضرارؓ

حلب کے معرکے میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا تھا جب غازیانِ اسلام حلب کے قلعہ کے سامنے ڈیرے ڈالے پڑے تھے تو رومیوں کی ساری توجہ جاسوسوں کے ذریعے ان کے حالات معلوم کرنے پر مرکوز تھی۔ رومی جاسوس رات کے وقت قلعے سے باہر نکل کر اسلامی لشکر کا جائزہ لیتے لیکن انہیں کوئی غافل نظر نہ آتا۔ رزم گاہوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھانے والے غازی رات کے وقت عبادتِ الٰہی میں مصروف نظر آتے۔ سالارِ لشکر ابوعبیدہؓ کا زیادہ تر وقت قرآن خوانی میں گذرتا اور یہ شب بیداری رومیوں کے لیے تشویش کا باعث بنی ہوئی تھی۔

ایک رات جاسوسوں نے رومیوں کو اطلاع دی کہ یہ وقت شب خون مارنے کے لیے نہایت موزوں ہے اس وقت اسلامی لشکر میں کچھ غفلت کے آثار نظر آرہے ہیں۔ چنانچہ رومی لشکر نے یوقنا کے زیرِ قیادت نکل کر اچانک حملہ کیا اور اس حملے سے مسلمانوں کو

بھاری نقصان پہنچا۔ خالدؓ بن ولیدؓ کی بصیرت اور ان کی غیر معمولی جنگی صلاحیت کے باعث اسلامی لشکر مزید نقصانات سے بچ گیا۔ انہوں نے رومیوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا اور رومیوں کی توقع سے زیادہ انہیں ہزیمت بھی دی۔ لیکن بایں ہمہ ،وہی پچاس مسلمانوں کو پکڑ کر لے گئے۔ دن کے وقت رومیوں نے اسیر مسلمانوں کو زنجیروں میں جکڑ کر قلعہ کی دیوار پر کھڑا کر دیا۔ اور ایک ایک کر مسلمانوں کی نگاہوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شہید ہونے والے مسلمانوں کی استقامت رومیوں کے لیے حیرت انگیز تھی ہر غازی جان سپاری کے وقت اسی طمانیت کا اظہار کر رہا تھا۔ جو ایک مومن کا سرمایہ حیات ہوتی ہے۔ خالدؓ بن ولیدؓ اور ابو عبیدہؓ اس صورتِ حال سے بہت برہم ہوئے۔ اور خالد اپنے ایک ایک شہید کے خون کا انتقام لینے کے لیے بے قرار تھے خالد کے تیور سے اسلامی لشکر کی حفاظت وصیانت کا مزید اہتمام کر لیا گیا۔

ایک دن رومیوں کو اطلاع ملی کہ اسلامی لشکر کا دستہ صبح کے وقت پیچھے کی طرف گیا تھا جو ابھی تک واپس نہیں آیا۔ رومی جاسوسوں نے کہا کہ ان کے ساتھ بار برداری کے اونٹ تھے جو اس امر کی علامت معلوم ہوتے ہیں۔ کہ مسلمان مفتوحہ علاقوں سے لشکر کے لیے رسد فراہم کرنے گئے ہیں۔ انہیں راستے میں گھیر کر تباہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ

رومی کمانڈر کی ہدایت کے مطابق ایک ہزار رومی سپاہیوں پر مشتمل فوج کا ایک دستہ رات کی تاریکی میں ان کی تلاش کے لیے نکل گیا۔ ان رومیوں نے مسلمانوں کو گھیر لیا۔ مسلمانوں نے جم کر مقابلہ کیا۔ دس کے قریب شہید ہو گئے اور باقی مجاہد رومیوں کا محاصرہ توڑ کر اپنے لشکر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ رومی دستہ قلعہ کے چور دروازے سے نکل کر پوشیدہ راستوں کے ذریعے مسلمانوں پر حملہ آور ہوا تھا جس کا ابوعبیدہؓ اور ان کے ساتھیوں کو علم نہ ہو سکا۔ خالد اور ابوعبیدہؓ اس سوچ میں پڑے تھے کہ قلعہ کو محاصرہ میں لے لینے کے باوجود یہ کہاں سے نکل گئے ہیں۔ خالدؓ نے ابوعبیدہؓ سے کہا کہ خدا تعالیٰ کی تائید و نصرت ہو میرے شامل حال ہے۔ اس پر کامل بھروسہ کرتے ہوئے میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ چور دروازہ سے نکل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہونے والے رومیوں کے لیے میں تنہا ہی کافی ہوں۔ میں ان کی تلاش میں جاتا ہوں۔ لیکن ابوعبیدہ کے مشورے سے خالد نے ایک فوجی دستہ ساتھ لے لیا۔ اسلامی لشکر سے دور ایک بستی جو مسلمانوں کے زیر نگیں آ چکی تھی، اس کے باشندوں سے صورتِ حال معلوم کی گئی۔ تو انہوں نے بتایا کہ ہم میں سے کسی نے صلح کے معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی۔ یہ رومیوں کا فوجی دستہ تھا جو مسلمانوں

کو ہلاک کرنے کے بعد پہاڑی علاقے میں چھپ گیا ہے۔ خالدؓ بن ولید نے بستی والوں کی مدد سے رومی دستے کا سراغ لگانا شروع کیا۔ وہ گھوڑوں کے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے ایک پناہ گاہ کے قریب پہنچ گئے اور خالد نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ نامعلوم پہاڑی مقام کی طرف پیش قدمی کرنے سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہم اس جگہ سے چھپ رہیں رات کی تاریکی میں رومی پہاڑ سے نکل کر قلعہ کی طرف روانہ ہوں گے تو ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔ خالدؓ نے اپنے فوجی دستے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کی قیادت ان کے اپنے ہاتھ میں تھی۔ اور ایک قائد ضرارؓ بن ازور تھا۔

رات کی تاریکی میں جب رومی دستہ پہاڑ سے نکل کر حلب کے قلعہ کی طرف روانہ ہوا تو خالدؓ کمین گاہ سے نکل کر عقاب کی طرح حملہ آور ہوئے رومیوں نے گھبراہٹ میں پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن ضرارؓ کا غیر متوقع حملہ ان کے لیے عذاب الٰہی ثابت ہوا۔

خالدؓ اور ضرارؓ کے عقابی حملے رومیوں کے لیے پیغام اجل ثابت رہے تھے۔ خالدؓ ابوعبیدہؓ سے یہ کہہ کر آئے تھے کہ وہ تنہا کافی ہوں گے۔ اور اب ان کے ساتھ ضرارؓ بھی تھے چنانچہ خالدؓ کی جانبازیوں سے سات سو رومیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور تین سو کو زندہ گرفتار کر کے

ابو عبیدہ کے پاس لے آئے وہ اپنے اس کارنامے کو ذاتی شجاعت و بہادری کا نتیجہ قرار دینے کی بجائے خدا تعالیٰ پر توکل تام کا نتیجہ قرار دے رہے تھے۔

محبت کے عطیات

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ ان کے لیے حضورؐ کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ نبوت سے غایت درجہ قرب کے باعث انہیں جوتے والا، تکیے والا اور وضو کے پانی والا کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ وہ القابات کو اپنے لیے سرمایہ نازش و افتخار سمجھتے تھے۔ صحابہؓ کا یہ معمول تھا کہ انہیں حضورؐ زندگی میں ایک بار بھی محبت کے کسی لفظ سے یاد کر لیتے تو وہ اس لفظ کو جزو زیست بنا لیتے۔ ماں باپ کے عطا کردہ نام پر حضورؐ کا عطا کیا ہوا نام فوقیت لے جاتا۔ ابوہریرہؓ کے نام سے آج کون واقف ہے؟ بات اتنی سی تھی۔ کہ ان کے گرد بلیوں کو دیکھ کر حضورؐ نے انہیں پیار سے بلیوں والا کہہ دیا۔ اور وہ بلیوں والے بن گئے۔ ابوہریرہؓ کہلانے میں انہیں لذت محسوس ہونے لگی۔ محبت کی ہر ادا چونکہ مقبول ہوتی ہے۔ اس لیے انہیں صحابہؓ بھی ابوہریرہؓ کہہ کر پکارنے لگے۔ احادیث میں بھی ان کی روایت ابوہریرہؓ کے نام سے ہونے لگی۔

بلیوں والا بظاہر کوئی اعلیٰ خطاب نہیں لیکن جس ذات کی زبان سے

یہ ملا تھا۔ وہ اعلیٰ تھی۔ اسی لیے۔ یہ بھی مقبول ہوگیا۔ مقبولیت کس چیز کی ہوئی؟ محبت کی، محبت کے عطیے کی، اس مقدس جذبے کی، جو محبت کی پیداوار تھا۔ محبت جب عطا و بخشش پہ آمادہ ہوتی ہے۔ تو زر و جواہر ہی نہیں لٹاتی پیار کے الفاظ سے بھی نوازتی ہے۔ اس کے لب و لہجے میں تصنع نہیں ہوتا ہے بلکہ محبت کی پکار میں بے ساختہ پن ہوتا ہے۔

ماں کا جذبۂ محبت جب عروج پہ ہوتا ہے۔ تو وہ بچے کو پیار کے الفاظ سے یاد کرتی ہے۔ یہ الفاظ فصیح و بلیغ نہیں ہوتے۔ سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ بچہ بھی انہیں تولتا نہیں جانتا۔ وہ محبت کی زبان سمجھتا ہے۔ محبت کی ادا شناس ہوتی ہے۔ وہ زبان بھی سمجھتی ہے، اور کیفیات بھی، عقل نہ زبان سمجھتی ہے، نہ کیفیات، وہ دونوں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہے۔ الفاظ کی تراش خراش اور صناعی اس کا کام ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں بے روح ہوتی ہیں۔

حضورؐ نے ایک بار حضرت علیؓ کے سرہانے کھڑے ہو کر دیکھا تو وہ زمین پہ لیٹے تھے اور ان کے جسم پر مٹی لگی تھی۔ حضورؐ نے انہیں مٹی والا کہہ کر اٹھایا۔ اسی دن سے علیؓ ابو تراب بن گئے۔

محبت کی فطرت ہے کہ وہ محبوب کو جس رنگ میں دیکھے نثار ہوتی ہے۔ حضورؐ کے دل میں شفقت و محبت کا جذبہ بہ حضرت علیؓ کی اس کیفیت

نے پیدا کیا جو بان پر مٹی لگنے سے طاری تھی۔ علیؓ کی یہی کیفیت بوترابؓ کے الفاظ بن کر نبوت کی زبان پر آگئی۔ وہ اٹھے، اور ان کے ساتھ محبت کے کئی طوفان اٹھ کھڑے ہوئے۔

محبت کے طوفانوں کو محبت کی زبان سے بیدار کیا جا سکتا ہے نفرت میں یہ قوت نہیں۔ کہ وہ محبت کے کسی خفتہ جذبے کو بیدار کر سکے محبت خود بیدار ہے۔ بیداری اسی کے ذریعہ پیدا کی جا سکتی ہے۔ نفرت نہ خود بیدار ہے نہ بیدار کر سکتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے زبان نبوت سے نکلا ہوا خطاب قبول کر لیا۔ تو یہ کیا تھا؟ یہ محبت کی بیداری ہی تو تھی۔ علیؓ ابن ابی طالب بوتراب بننے کے لیے تیار ہو گئے تو یہ بھی محبت ہی کی بیداری تھی۔ اور عبداللہؓ بن مسعودؓ جوتے والا کہلانے پر رضامند ہو گئے تو یہ بھی محبت ہی کی بیداری کا کرشمہ تھا۔ عقل جوتے والا کب کہلا سکتی ہے؟ اسے تو ایسے القابات سے عار محسوس ہوتی ہے۔ وہ جھک کب جاتی ہے۔ جھکنا اور محبوب کے ہر عطیے کو سینے سے لگانا تو صرف محبت کا شیوہ ہے۔ عقل کے بھولپن کے خطابات پائے بھی کب ہیں اسے تو عیّار اور مکّار ہی کہا گیا ہے۔